جہانِ غالب
4
ga

جہانِ غالب

شش ماہی

جلد دوم شمارہ - 4

نگراں

خواجہ حسن ثانی نظامی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

شش ماہی

جلد دوم : شمارہ:4، جون 2007 تا نومبر 2007

قیمت فی شمارہ: =/20 روپے

قیمت سالانہ: =/40 روپے

ڈاک سے: =/50 روپے

کمپوزنگ : علیزہ کمپیوٹر سنٹر، کبیر نگر، دہلی۔

طابع وناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری، غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔ 110013

اس شمارے میں شائع مضامین سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے ایم۔آر۔ پرنٹرس، 2816، گلی گڑھیا، دریا گنج، نئی دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست

●●●

اس شمارے کے بارے میں

اس شمارے کے ساتھ جہان غالب کی عمر کے دو سال کی تکمیل ہو رہی ہے۔ پچھلے تینوں شمارے پسند کئے گئے۔ ابھی تک جہان غالب کے بیشتر مضامین اکیڈمی کے جلسوں اور سیمیناروں میں پڑھے گئے تھے۔ یہ سلسلہ اس شمارے میں بھی بدستور قائم ہے۔ گزشتہ شمارے میں جناب وشنو کھرے صاحب کا ایک لیکچر ''غالب کے مغربی معاصرین'' کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا جسے جہان غالب کے حلقے میں پسند کیا گیا۔ اس شمارے میں پروفیسر ہریش ترویدی صاحب کا لیکچر ''غالب اردو میں غالب ہندی میں'' شائع کیا جارہا ہے۔ یہ لیکچر انھوں نے مرزا غالب کے یوم ولادت کے موقع پر 27/دسمبر 2006 کو منعقدہ ایک تقریب میں دیا تھا جسے صدا بند کرلیا گیا تھا وہ لیکچر تحریری طور پر تفہیم غالب کے تحت پیش کیا جارہا ہے۔ انداز گفتگو کا ہے زبان ہندوستانی ہے۔ اصل مقصد لیکچر کو قارئین تک پہچانا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب صدی تقریبات کے موقع پر صرف اردو میں ہی نہیں ہندی میں بھی کلام غالب کو سمجھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ پروفیسر ہریش ترویدی نے ہندی میں غالب پر چار کتابوں (غالب کی کویتا، غالب اُگر، سردار جعفری کا دیوان غالب اور انو دیتا) کے حوالے سے کلام غالب کے مطالعے کا جائزہ لیا ہے۔ 27/دسمبر 2006 کو منعقد ہونے والی تقریب کی صدارت لندن کے مہمان اسکالر ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے کی تھی۔ ان کی تقریر سے ماخوذ اقتباس بھی شائع کیا جارہا ہے۔

24/ فروری 2007 کو غالب اکیڈمی نے ''غالب اور عہد حاضر'' کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا تھا۔ سیمینار میں پڑھے گئے چند مقالات شامل اشاعت ہیں۔ پہلا مقالہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کا ''غالب اور عصر حاضر'' ہے جس میں عہد حاضر میں غالب کی مقبولیت کا سبب ان کی تجریدی فکر اور اشعار میں ابہام بتایا گیا ہے۔ دوسرا مقالہ پروفیسر شمیم حنفی صاحب کا ''غالب اور ہمارا عہد'' ہے جس میں غالب کو اقبال اور منٹو کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ ''اقبال اور منٹو دونوں کا غالب کو یکساں ذہنی اور جذباتی آمادگی کے ساتھ قبول کرنا اپنی ایک خاص منطق رکھتا ہے اور اس منطق کا ظہور غالب کی انفرادی فکر اور ان کی انوکھی شخصیت دونوں کی تہہ سے ہوا ہے''۔ تیسرا مقالہ ڈاکٹر خالد جاوید کا ''ہمارے عہد میں غالب کی شاعری کی آہٹیں'' ہے جس میں غالب کی شاعری کو وجودی فلسفے کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ مانا گیا ہے کہ ''غالب کی تمام شاعری وجود کے کرب کی داستان ہے''۔ چوتھا مقالہ ڈاکٹر ارجمند آرا کا ''بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کا نقیب غالب'' ہے جس میں سماجیاتی نقطہ نظر سے غالب پر نظر ڈالی گئی ہے۔ موجودہ سماجی اور تہذیبی منظر نامے میں غالب کی تفہیم کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ پانچواں مقالہ ڈاکٹر شکیل اختر کا ''غالب اور آل انڈیا ریڈیو'' ہے۔ اس اعتبار سے معلوماتی ہے کہ اس میں آل انڈیا ریڈیو سے غالب پر نشر ہوئے پروگراموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مصور فطرت شمس العلما خواجہ حسن نظامی نے 1857 پر کئی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ان ہی میں ایک کتاب میرزا غالب کا روزنامچہ بھی ہے۔ اس کتاب میں غالب کی تحریروں سے 1857 کے حالات اور غالب کے حالات نکال کر اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ یہ کتاب غالب پر اور 1857 پر ایک اہم کتاب ہے۔ اسے غالب اکیڈمی 1857 کی 150ویں سالگرہ کے موقع پر شائع کر رہی ہے۔ نمونے کے طور پر کچھ اقتباسات اس شمارے میں دیے جا رہے ہیں۔ آخر میں اکیڈمی کی سرگرمیوں اور کتابوں کے تعارف شامل اشاعت ہیں۔ امید ہے کہ یہ شمارہ بھی پسند آئے گا۔

***

پروفیسر ہریش ترویدی

غالب اردو میں غالب ہندی میں

میں یہ کہتا رہتا ہوں اردو والوں سے ''تم جانو رسم الخط سے تم کو جو رسم راہ ہو اور ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے۔'' کیونکہ ہم تو اردو نہیں سیکھ پائے، اب بھی نہیں پڑھ پاتا ہوں، مگر غالب کو پڑھنا 1960-1961 سے شروع کیا۔ ہند پاکٹ بکس نے ایک ایک روپے کی چھ کتابیں چھاپی تھیں، اس زمانے میں 14-15 سال کا تھا میں نے دو کتابیں خریدیں ایک ٹیگور کی گیتا نجلی اور دوسرا دیوان غالب، پرکاش پنڈت کا ترجمہ کیا ہوا۔ وہ دیوان غالب اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس کو میں نے اتنا پڑھا ہے، اتنی بار پڑھا ہے کہ اب اس کا شیرازہ تھوڑا بکھر رہا ہے لیکن اب بھی میں اس کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ لگاتار پڑھتا رہتا ہوں۔ پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا کھڑے ہو کر سُنانا پڑتا ہے تب لگتا ہے کہ پڑھا ہے تو سنا بھی سکتا ہوں۔ لیکن کتنا سمجھتا ہوں یہ دوسری بات ہے۔

دیوان غالب میں سب کو پتہ ہے کہ پہلا ہی شعر مشکل ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

لوگ ٹھوکر کھا کر زمین پر گر جاتے ہیں اس کو سمجھنے اور سمجھانے والے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں۔ دیوان غالب میں بعد میں کلام آسان بھی ملتا ہے اور ایسا بھی ملتا ہے کہ فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔ پرکاش پنڈت کے دیوان غالب میں جہاں جہاں مشکل الفاظ آتے ہیں وہاں نیچے ایک فٹ نوٹ لگا دیتے ہیں اور اس میں ہندی میں کیا مطلب ہے سمجھا دیتے ہیں تو اس طرح ہم لوگوں نے غالب پڑھا ہے۔ میں نے ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں نے پڑھا ہے اور اب تو ایسا کہنے والے بہت سے لوگ ہیں کہ اردو میں غالب پڑھا ضرور جاتا ہے لیکن ہندی میں تھوڑا زیادہ ہی پڑھا جاتا ہے۔ جتنا چھپتا ہے جتنا بکتا وہ کم نہیں ہے، اردو میں بہت ایڈیشن نکلے ہیں غالب کے، فُٹ نوٹ کے ساتھ بھی۔ اس کے علاوہ بھی ان کا جتنا ذکر ہوتا ہے، ان پر جتنا لکھا جاتا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

غالب کو ہندی میں پڑھنا مشکل تو ہے، غالب اردو میں بھی مشکل ہے۔ آپ صرف اردو جانتے ہیں اور غالب پڑھنا چاہتے ہیں میں نہیں مانتا یہ کام آسان ہے۔ ہندی میں تھوڑا اور مشکل ہے اور ہندی میں فرق بھی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کسی بھی بڑے شاعر کو پڑھیں تو یہ بات ضرور سوچنے کی ہے کہ آپ نے کون سے اور شاعر پڑھے ہیں، اس کے پہلے کیا پڑھا ہے، اس کے ساتھ ساتھ کیا پڑھ رہے ہیں۔ زمین کیا ہے، جس میں آپ وہ پودہ جوت رہے ہیں۔ جو لوگ ہندی میں پڑھتے ہیں وہ کچھ اور پڑھ کر آئیں ایسا نہیں ہے۔ جو غالب کو ہندی میں پڑھتا ہے، اس نے میرؔ کو نہیں پڑھا ہے صرف اردو جانتے ہیں وہ جو غالب پڑھتے ہیں اور جو اردو کے علاوہ بھی کچھ جانتے ہیں اور اردو کے علاوہ بھی کچھ شاعروں کو پڑھ چکے ہیں ان کے غالب پڑھنے میں کیا فرق ہے؟ ان کو کیا سمجھ میں آتا ہے؟ وہ اپنی طرف سے کیا ڈالتے ہیں، غالب پڑھتے وقت؟ غالب، ہندی میں جو پڑھا جا رہا ہے اس کو سمجھنے کی طرف میں چار کتابوں کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

ایک "غالب کی کویتا" جو 1957 میں چھپی تھی۔ دوسری " غالب اُگر" ہے جو 1959 میں چھپی تھی۔ تیسری ہے سردار جعفری کی کتاب جو ہندوستانی اکیڈمی، بمبئی نے 1958 میں چھاپی تھی اور چوتھی کتاب ''انودیتا'' جس کا نام ہے یہ 1969 میں چھپی ہے۔ ان سب میں میں نے غالب پڑھا ہے۔ ان سب کو میں نے دیکھا ہے اور یہ ہندی کے غالب ہیں جو آپ ان کتابوں میں پا سکتے ہیں۔ تھوڑا میں ان کے بارے میں بات کروں گا۔ پھر میں ہندی کے جو کوی ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر ہم لوگ آتے ہیں غالب کی طرف، ان کے بارے میں بھی تھوڑی بات کروں گا۔ ہندی کے کویوں میں اور اردو کے شاعروں میں غالب کو ملا کے کتنا فرق ہے؟ اور اس فرق سے کتنا مزا اور آتا ہے غالب کو پڑھنے میں اس کا بھی تھوڑا ذکر ضروری ہے۔

پہلے ''غالب کی کویتا'' کی بات کرتا ہوں ۔ یہ دیوناگری میں ہے۔ اس کے ایڈیٹر کرشن دیو پرساد گوڑ ہیں۔ بنارس میں رہتے تھے ان کا تخلص بے ڈھب تھا۔ تھوڑی شاعری بھی کرتے تھے۔ بے ڈھب بنارسی کے نام سے ان کی کتابیں ہیں۔ لیفٹینینٹ پکسن کی ڈائری'' بہت عمدہ کتاب ہے۔ ایک انگریز آتا ہے وہ بھی ہندی سیکھنا چاہتا ہے، اردو سیکھنا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں لوگ کیا سوچتے ہیں؟ اس کا نام انھوں نے رکھا ہے لیفٹینینٹ پکسن۔ انھوں نے غالب کی کویتا کے علاوہ ایک کتاب اور نکالی تھی ''روح سخن''۔ اس میں بھی اردو شاعری ہے۔ غالب کی کویتا صرف غالب کے بارے میں ہے۔ اکہتر صفحے کے تعارف میں بڑی تفصیل سے غالب کے بارے میں بات کی گئی ہے اور اس کا انتساب جو ہے وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو زبانوں کے محدود دائرے سے باہر ہیں۔ زبانوں کے بیچ میں جو دیواریں ہوتی ہیں ان سے اوپر اُٹھ رہے ہیں اور اس کتاب کے

فلیپ پر پبلیشر نے لکھا ہے۔ بے ڈھب نے تو نہیں لکھا ہوگا کہ اس طرح کا گرنتھ اردو میں بھی نہیں ہے۔ جتنی باتیں غالب کے بارے میں اس کتاب میں ہیں وہ اردو میں بھی کسی ایک کتاب میں نہیں ملیں گی۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ غالب کے من میں ہندو مسلم کا خیال ہی نہیں تھا۔ ان کے بہت سے دوست تھے، بہت سے شاگرد تھے وہ ہندو تھے۔ تھوڑا مشکل لکھتے تھے، مشکل پسند شاعر تھے۔ تعارف میں انھوں نے لکھا ہے کہ حکیم علائی جان عیش نے جو طنز کیا تھا وہ بھی اس میں انھوں نے دیا ہے۔ انھوں نے غالب کے بارے میں کہا تھا کہ ''اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے، مزا کہنے کا جب ہے ایک کہے دوسرا سمجھے'' ان کے زمانے میں ہی ان کے بارے میں کہا گیا تھا، غالب کس طرح سے مشکل ہیں؟ جیسے ہندی میں جے شنکر پرساد مشکل ہیں یا جیسے انگریزی میں براؤن مشکل ہیں۔ فلسفہ اچھی بات ہے بری بات نہیں ہے۔ اور اسی تعارف میں انھوں نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی بات اُٹھائی ہے کہ انھوں نے لکھا تھا کی ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہی ہیں مقدس وید اور دیوان غالب۔ اس کا ذکر بے ڈھب بنارسی نے کیا لیکن کچھ اور نہیں کہا کہ جیسے تھوڑا زیادہ کہہ گئے ہیں۔ بجنوری صاحب نے غالب کی مشکل پسندی کے بارے میں لکھا ہے کہ بعد میں ان کی شاعری سادہ ہوگئی۔ فارسی پن انھوں نے کم کیا ''آکاش سے دھرتی پر آئے'' اور بعد میں اور سادگی ہے، بہت رسیلی کویتا ہے۔ ایک بات بے ڈھب نے اور کہی ہے جس پر ہندی کے پڑھنے والے بار بار غور کریں گے۔ انھوں نے شروع میں کہا اور بعد میں اور لوگ بھی کہتے رہے ہیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ غالب نے شنکر اچاریہ کی فلسفیانہ فکر کا مطالعہ کیا تھا۔ ہندو پنڈتوں سے بھی ان کا رابطہ نہیں رہا، تب بھی ان کے خیال میں دنیا مایا ہے وید کی بات تو نہیں ہے۔ وید اور دیوان غالب کو آپ نہیں ملا سکتے لیکن بے ڈھب بنارسی نے کہا ہے کہ ویدانت سے آپ ضرور ملا

سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ دکھانے کے لئے اشعار کوٹ کیے ہیں جو اور لوگوں نے کوٹ کیے ہیں ہندی میں۔ ''جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود، پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے''۔ ''سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں "ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے''؟ یا'

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں آئے

یا:

''بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یا ایک اور شعر انھوں نے کوٹ کیا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یہ سب کہنے کے بعد انھوں نے کہا ہے کہ میر کو الگ کر دیا جائے تو غالب اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ کئی لوگ تو کہیں گے کہ غالب ہی سب سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن ہندی میں کچھ ایسا لگتا ہے کہ غالب کا جو فارسی پن ہے وہ تھوڑا آڑے آتا ہے اور وہ میر میں اتنا نہیں ہے۔ میر ہیں، نظیر ہیں، فراق ہیں اور بھی ہیں ان میں وہ بات نہیں ہے کہ فوراً مشکل لگے۔

سردار جعفری صاحب نے 1958 میں دیوان غالب شائع کیا۔ اس میں بھی انھوں نے وہی کام کیا۔ اسی طرح کے فٹ نوٹ لگائے ہیں۔ اسی طرح کا تعارف لکھا ہے، لیکن ایک بات اور سامنے آتی ہے، سردار جعفری صاحب نے ہندوستانی اکادمی کی طرف

سے جو دیوان چھاپا ہے وہ یہ مان کر چھاپا ہے کہ ہندوستانی ہندی اور اردو کے بیچ کی زبان ہے جیسا سب لوگ مانتے ہیں۔ ان کا مطلب اگر ہندوستانی میں سمجھایا جائے تو یہ دونوں زبانوں میں برابر سمجھ میں آئے گا۔ اس لئے ہندوستانی اکادمی کی طرف سے دیوان غالب اور دیوان میر دونوں کتابیں شائع ہوئیں۔ بیڈھب بنارسی نے شعروں کا مطلب یا الفاظ کا مطلب کافی ٹھیٹ ہندی میں سمجھایا ہے، کافی سنسکرت والی ہندی میں سمجھایا ہے۔ لیکن سردار جعفری نے جو ہندوستانی میں سمجھایا ہے اس میں آپ ملاحظہ فرمایئے:

"وہ سوچھند ساہس کے ساتھ آنوتیش لالسا کو بھی آوشک سمجھتا ہے اور
ایک اتینت مردل لولپتا کی منزل میں پہنچ جاتا ہے"

یہ کیا ہے؟ یہ اردو ہے، یہ سنسکرت ہے، یہ ہندی ہے، ہندوستانی ہے۔ یہ اگر ہندوستانی ہے تو آیئے ہم سب لوگ مل کر اس سے پناہ مانگیں۔

ایک بات اور میں کہنا چاہتا ہوں سردار صاحب کی توہین نہیں ان کی تعریف میں کہ سردار جعفری سات جنم اور لیں تب بھی یہ جملہ نہیں کہہ سکتے۔ انھوں نے لکھا کسی اور زبان میں ہوگا اور پھر کسی نے ترجمہ کیا ہے اور اتنی سنسکرت والی ہندی میں ترجمہ کیا ہے کہ شاید سردار جعفری خود پورا نہیں سمجھ پاتے، تھوڑا تو سمجھ جاتے کیونکہ انھوں نے لکھا تھا لیکن پورا نہیں سمجھ پاتے۔ ہندوستانی اردو اور ہندی کے بیچ میں ہے غالب جیسے بیچ میں ہی کھڑے ہیں۔ ہندی والے بھی پڑھ رہے ہیں اردو والے بھی پڑھ رہے ہیں۔ ہندوستانی میں غالب کو سمجھایا جا سکتا ہے کہ نہیں؟ انھوں نے ہندوستانی میں نہیں لکھا۔ یہ سوال اٹھتا ہے بے ڈھب بنارسی اور سردار جعفری دونوں کے یہاں پڑھنے پر یہ بات آئے گی۔

دیوان غالب کا تیسرا ایڈیشن جس کا میں آپ سے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ہے وہ ہے

اُگر (تخلص) ہندی کا ہے۔ اُگر کے معنی ہیں بہت تیز، تھوڑا غصیل۔ سنسکرت کا لفظ ہے۔ ان کا پورا نام ہے "پانڈے بچن شرما اُگر"۔ 1921 میں پیدا ہوئے تھے۔ ہندی کے عظیم شاعر نرالا کے دوست تھے۔ کلکتہ میں دونوں ساتھ رہتے تھے۔ مدھوبالا نام کا ایک رسالہ نکلتا تھا اس میں دونوں مدد کیا کرتے تھے۔ اکھڑ تھے، بنارسی تھے۔ یہ بھی بنارسی تھے اور یہ بیڈھب تھے۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر غالب کی عالمی خصوصیت اُگر کی لکھی ہوئی تشریح۔ دنیا میں سب سے مشہور شاعر تو غالب ہیں ہی لیکن یہ بھی کم نہیں ہے کی دنیا میں سب سے الگ عالمی خصوصیت کے حامل اپنے آپ کو کہا ہے اُگر نے اور ان کا انداز بھی وہی تھا انھوں نے طویل تعارف لکھا ہے غالب کے بارے میں ان کی سوچ کیا ہے؟ غالب کی اس طرح سے کتاب کا نام ہے "غالب اُگر" یہ ہندی کی روایت ہے۔ ہندی میں اگر بہاری پر کتاب لکھیں، بہاری کے دوہے سمجھاتے ہوئے اور آپ کا نام ہورتنا کر تو کتاب کا نم ہوتا ہے بہاری رتنا کر، اسی طرح اس کا نام ہے "غالب اگر"۔ بیسوں برس یہ دیوان میرا منہ لگا دوست جیسا رہا ہے بنارسی مگہی پان کی طرح جیسے مگہی پان منہ لگا رہتا ہے اسی طرح یہ دیوان منہ لگا ہے پچھلے چالیس برسوں سے انھوں نے لکھا ہے۔

غالب پر میں نے اتنا لکھ تو دیا ان کے پورے معنی سمجھا دئے لیکن مجھے نہ عربی آتی ہے نہ فارسی انھوں نے ایک شعر غالب کا ہی لکھا ہے

جو یہ کہے کہ "ریختہ کیوں کے ہو رشک فارسی

گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا" کہ یوں

یہ غالب کا ہی شعر ہے اس کے بعد اُگر نے لکھا ہے جو یہ کہے کہ فارسی اردو جانے بغیر کوئی دیوان غالب جیسی مشکل کتاب کی شرح کیسے ہو سکتی ہے اسے یہ غالب اُگر

کتاب ایک بار پڑھا کر سنا کہ یوں۔انھوں نے ٹھاٹ اکھڑپن سے کہا ہے۔انھوں نے ایک اور بات کہی ہے جو بیڈھب بنارسی نے نہیں کہی وہ جب بھی غالب کے معنی سمجھاتے ہیں تو ان کو ہندی کے طرح طرح کے شاعر یاد آتے ہیں ان کو بہاری یاد آتے ہیں، ان کو تلسی داس یاد آتے ہیں اور ایک دو بار ہی نہیں کم سے کم بیس پچیس بار یاد آتے ہیں اور تلسی داس میں کیا یاد آتا ہے کہ وہ فوراً لکھتے ہیں وہاں جہاں وہ مطلب سمجھا رہے ہیں۔ایک اور فرق ہے ان میں اور بیڈھب بنارسی میں، کہ بیڈھب بنارسی تو جتنے مشکل الفاظ تھے ان کے معنی بتا دیتے تھے اور جب اس کے بعد بھی پورا شعر مشکل بنا رہتا تھا تو اس کا پورا مطلب لکھ دیتے تھے۔انھوں نے الفاظ تو سمجھائے لیکن ہر ایک شعر کا پورا کا پورا مطلب ہندی میں بھی لکھا۔یہ میرا خیال ہے کہ بڑی بھاری بات ہے۔

پرکاش پنڈت کو میں نے پڑھا اور لوگ بھی پڑھتے رہتے ہیں اس میں یہ سمجھ نہیں آتا کہ آپ کو کسی بھی شعر کے پانچ چھے الفاظ جن کے معنی چاہے ہندی میں بتا دئے جائیں تب بھی شاید شعر سمجھ میں نہیں آئے گا تو ان لوگوں نے یہ بات پکڑی اور پھر پورا کا پورا شعر ہندی میں لکھا اور کب یاد آتے ہیں میں ایک مثال دیتا ہوں۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اس میں ان کو کیا یاد آتا ہے ان کو رام چرت مانس کے تلسی داس کی چوپائی یاد آتی ہے، ایک چھوٹا سا کردار جو وردان وہ قبول تو کر لیتا ہے بھگوان نے دیا ہے اس کو (پربھو جو دین سو پر میں پاوا) پربھو نے جو مجھے دیا وہ تو میں پا گیا (اب سو دیہو موہی جو بھاوا) اب جو مجھے پسند ہے وہ بھی تو آپ دیجئے۔یہ ان کو یاد آتی ہے تلسی داس کی چوپائی اسی طرح اپنی

طرف سے کچھ بڑھا بھی دیتے ہیں۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اس کا مطلب وہ لکھتے ہیں کہ شاعر شرم تم کو نہیں آتی لاج گھول کر پی گئے۔ اب وہ لاج گھول کر بھی پی گئے یہ انہوں نے اپنی طرف سے بڑھایا ہے ایک چیز بار بار آتی ہے کہ غالب کے کچھ شعر ہیں جن میں لگتا ہے کہ ہندو فلسفہ ہے۔ انھوں نے بڑھانے کی کوئی بات نہیں کی بیڈھب بنارسی نے کہا شنکراچاریہ تو انھوں نے نہیں پڑھا۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ ان کا مشہور شعر ہے اس کو ہندی میں کس طرح سمجھایا گیا ہے یہ جو الفاظ ہیں وہ ہمارے یہاں وید سے تو نہیں اپنیشد سے چلے آرہے ہیں اور یگانہ، یکتا، دوئی یہ سن کے فوراً ہندی والوں کو اسی کی یاد آتی ہے اور پوری جو Philosophy ہے اس کے ساتھ جو جڑی ہوئی ہے وہ پوری کہ پوری سامنے آجاتی ہے۔

میرا خیال ہے اردو والوں کو نہیں آنا چاہئے نہیں تو اردو ہندی کا فرق مٹ جائے گا۔ اردو کی کچھ چیزیں مجھے نہیں آتیں۔

"انودتا" معنی جس کا انواد ہو چکا ہے یعنی جس کا ترجمہ ہو گیا ہے وہ انودتا ہے یہ کتاب دوارکا پرساد مشرا نے لکھی ہے 1971 کی چھپی ہے اور یہ تھوڑا اور آگے چلے گئے ہیں جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ بیڈھب بنارسی تو مشکل الفاظ کے معنی بتاتے تھے، پھر آئے اگر

وہ پورے شعر کا مطلب لکھتے تھے اور انھوں نے کام کو اور آگے بڑھایا یہ ہندی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ یہ مدھیہ پردیش میں کئی سال Chief Minister تھے 1969 میں مرکزی وزیر بھی بنائے گئے دلّی آئے تو مدھیہ پردیش سے کچھ دوستوں نے لکھا کہ اس سال غالب کا سو سالہ جشن منایا جارہا ہے تو اس میں ہم لوگ ایک کتاب چھاپ رہے ہیں اس میں غالب کے ترجمے شامل تھے، ہندی، بنگالی، مراٹھی، سنسکرت تو دوارکا پرساد نے ایک غزل کا ترجمہ کر کے بھیج دیا وہ لوگوں کو بہت پسند آیا، پسند تو آیا ہی ہوگا Chief Minister تھے۔ اس سے ان کو شہ ملی تو انہوں نے اردو سے سات سو شعر چنے اور ان کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ شروع سے ولّی سے لے کر فیضؔ کے بعد تک۔ سات سو اس لئے چنے کہ عیسٰی کے بعد کی پہلی صدی میں ایک کتاب آئی پراکرت پر "گاتھا سپت صدی" جس میں سات سو دوہے کی طرح کے چھند تھے دوہا تو نہیں تھا دوہا بعد میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد ہندی میں بہت سے لوگوں نے سات سو دوہے لکھے اور اس کی ایک کتاب بنائی۔

وہ جو اردو کے شعر سمجھتے ہیں، وہ کتنا سمجھ پائیں گے اور جو یہ سمجھتے ہیں وہ اردو کتنی سمجھ پائیں گے۔" کون دیکھ سکتا ہے اسے وہ انوبان، وہ ایک دوندلیش ہوتا اگر دکھتا ایک انیک "وہ یگانہ ہے وہ یکتا اس کا ہے "غالب درشن درشٹی تب، شیلی تب جیونت"، "ہوتا جب مدھم نہیں تجھے سمجھتے ساگر"، "ملی پریم میں ہی مجھے جیون کے سکھ بھوگ، ملی دوا بوروودھ کی، ملا بے دوا، روگ"۔ تھوڑا سمجھا بھی دیا ہے، (درد کی دوا پائی) تو یہ کون سا درد تھا اور کون سی دوا پائی۔ بعد میں ایک اور لائن تھی (درد بے دوا پایا) دنیا کے جو غم تھے اس کی دوا تو مل گئی، عشق کی دوا نہیں ملی یہ ایسا روگ ملا۔ یہاں صاف صاف لکھ دیا ہے (ملی دوا بھو روگ کی) یہ جو ساری دنیا ہمیں گھیرے ہوئے ہے، غمِ روزگار ہے، وہ بھو ہے۔ "یہ مندر کعبہ نہیں، چوکھٹ دوار نہ آڑ، چھیڑے مجھے رقیب کیوں بیٹھا ہے چلتی راہ"، "ہاتھ شکتی سے ہین

پر درشٹی درگو میں شیش، دوتم مجھ کو دیکھنے ششک، گھٹک، انیمیش" کتنا بڑا فاصلہ ہے یا کم فاصلہ ہے یا زیادہ فاصلہ ہے، وہی بات کہی گئی ہے یا دوسری بات ہوگئی ہے، "ہاتھ شکتی سے ہیں پر درشٹی درگو میں شیش" درگو تو ہندی کے لئے بھی تھوڑا بھاری ہے (ہاتھوں میں تو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے "دوتم مجھ کو دیکھنے ششک، گھٹک، انیمیش "ششک معنی پیالہ شدھ سنسکرت، گھٹک مطلب گھڑا شدھ سنسکرت اور انیمیش مطلب بنا پلک جھپکے دیکھنا، اس طرح سے دیکھنا کہ پلک بھی نہ جھپکے اس کشش سے دیکھنا، یہ تھوڑا بڑھایا ہے انھوں نے۔ لیکن ہے اسی طرح کا۔ "ہریالی سے ہیں بھرے میرے درودیوار، ہم تو ہیں بنواس پے آئی کھیل بہار" یہ تھوڑا مشکل ہے اس کا مطلب ہے ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے۔ اس میں مشکل کیا ہے "بیاباں" بیاباں تو جلدی یہاں ملتا نہیں جہاں ہندی بولنے والے لوگ رہتے ہیں وہ عربی فارسی سے تھوڑا فرق ہے، عربی سے خاص کر وہاں بیاباں تھوڑا جلدی مل جاتا ہے، یہاں نہیں ملتا ہے۔ یہاں ونواس ملتا ہے۔ جو وہاں رہتا ہے ونواس ہوتا ہے جو جنگل میں رہتا ہے وہاں ہریالی ہوتی ہے، خوب سبزہ اگتا ہے "ہریالی سے ہیں بھرے میرے درودیوار، ہم تو ہیں بنواس پے آئی کھیل بہار"۔

اب میں ایک قدم اور آگے چلتا ہوں کہ اردو سے ہم ہندی میں دھنستے ہوئے غالب کے بہانے غالب کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہاں تک آگئے۔ اب تھوڑا سا اور آگے چلیے غالب کا ہاتھ چھوڑ دیجیے، اب آپ بڑے ہو گئے ہیں۔ اب آپ اپنے آپ چلیے۔ ہندی میں جو ہم پڑھ کے آتے ہیں، ہندی کی شاعری، کویتا پہلے سے پڑھے ہوئے تھے اس کے بعد آتے ہیں ہم غالب کے پاس، تو ہم کیا پڑھ کر آتے ہیں اور کیا توقع ہوتی ہے اور کیا ہم چاہتے ہیں، کیا اچھا لگتا ہے کیا اچھا نہیں لگتا؟ غالب کی طرح کا ہندی میں شاعر کون ہے یا

جب غالب لکھ رہے تھے تب ہندی میں کون سے بڑے شاعر لکھ رہے تھے۔ یہ سوال پوچھتے ہی ہندی اور اردو کا بھید اور بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ کئی لوگوں نے کہا ہے کہ ہندی اور اردو کے ادب کا پورا ذکر ایک ساتھ دونوں کو ملا کر ہونا چاہیے۔ میں بھی یہ مانتا ہوں بہت ہی اچھی بات ہو اگر ایسا ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو پڑھنے والے ہندی پڑھنے والے دونوں کو ملا کر بٹھایا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ جب غالب اردو میں لکھ رہے تھے تو ہندی میں کون لکھ رہا تھا اور ہندی میں کچھ لوگوں کے نام لیے جائیں تو مشکل ہو جائے گی۔ غالب جب لکھ رہے تھے تو ان سے تھوڑا پہلے پیدا ہوئے تھے دونوں میں 30 سال کا Overlap تھا، ان کا نام ہے پدماکر۔ پدماکر اس زمانے کے ہیں۔ جب غالب کی زندگی کا آخری چھور آیا تو ایک اور ہندی کے بڑے بھاری کوی پیدا ہو گئے تھے۔ پدماکر میں اور غالب میں بہت فرق ہے، پدماکر غالب سے بڑے تھے یہ غالب سے بہت چھوٹے تھے اور ان کا نام ہے بھارتیندو ہریش چندر۔ ان کی پیدائش 1850 کی ہے غالب 69 میں نہیں رہے تو 19 سال دونوں زمین پر تھے ایک ساتھ، پھر بھارتیندو 1885 میں نہیں رہے 35 سال کی عمر میں۔ تو یہ دو شاعر ہیں جن کو آپ غالب سے ملا کر پڑھیں اور دیکھیں کہ رہتے تو وہیں تھے آس پاس میں، ایک ہی ہوا میں سانس لیتے تھے، اسی زمین پر چلتے تھے۔ لیکن شاعری میں بھی ہے کچھ ان کا جو ہم کہہ سکیں ایک ہی طرح کا ہے؟ لیکن اگر آپ کسی سے پوچھیں کہ غالب جیسا کوی ہندی میں کون ہے؟ کون ہندی کا ایسا کوی ہے جس کی غالب پڑھ کر یاد آتی ہو تو میرا خیال ہے زیادہ لوگ کہیں گے بہاری "بہاری لال" بہاری تو اور پہلے کے ہیں۔ اس میں کئی باتیں آتی ہیں ہندی- اردو آتی ہے ہندو- مسلمان کی بھی بات آتی ہے۔ تو میں آپ کو تھوڑا یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندی میں جو سب سے پرانے ہمارے شاعر ہیں اور سب سے بڑے شاعروں میں سے جو پرانے شاعر ہیں وہ قریب قریب سب مسلمان

ہیں۔مولانا داوود 14 ویں صدی میں لکھ رہے ہیں، اودھی میں لکھ رہیں اور دوہے چوپائی میں لکھ رہے ہیں، پھر شیخ منجن لکھ رہیں ہیں، شیخ قطبن لکھ رہے ہیں اور سب سے بعد میں ملک محمد جائسی لکھ رہے ہیں۔ملک محمد جائسی پدماوت لکھ رہے ہیں، اودھی بھاشا میں لکھ رہے ہیں۔

کھڑی بولی جب سے آئی اس سے پہلے تو اودھی میں ہی، برج بھاشا میں ہی کویتا ہوتی تھی۔جب سے کھڑی بولی شروع ہوئی اور بھارتیندو پہلے ایسے بڑے کوی ہیں جنہوں نے کھڑی بولی میں لکھا تب سے اردو اور ہندی بہت پاس پاس آگئیں۔اردو بھی کھڑی بولی ہے اور ہندی میں بھی کھڑی بولی آگئی 19 ویں صدی کے آخر سے۔اس سے پہلے اردو میں، برج میں، اودھی میں بہت سی چیزیں ہیں جو وہی ہیں، لیکن وہ الفاظ ہیں گرامر نہیں ہے، بہت فرق ہے ان دونوں میں۔تو یہ بڑا ساخا کہ ہے ہندی کی کویتا کا اور اردو کو ساتھ رکھ کر آپ دیکھیں گے جیسے بہاری ہیں۔بہاری کیوں یاد آتے ہیں؟ غالب کو پڑھ کے دو چیزیں ہیں۔ان کی بھی شاعری کافی عشقیہ ہے اور دوسری یہ کہ انہوں نے دوہے لکھے ہیں صرف دوہے۔اردو ہندی میں بڑا بھاری فرق ہے کہ ہندی میں زیادہ تر کویوں نے جس چھند میں لکھا ہے وہ چار Line کا ہوتا ہے اور چار بڑی Line کا ہوتا ہے، اردو میں چاہے چھوٹی ہو یا بڑی ہوں دو ہی Line ہوتی ہیں۔اس سے ایک شعر پورا ہو جاتا ہے۔تو تھوڑا اور کہنے کا موقع ملتا ہے۔لیکن بہاری کو آپ دیکھئے، اس سے تھوڑے اور فرق سامنے آئیں گے "چھوٹی نہ ششوتا کی جھلک، جھلکیوں جوبن انگ، نیمتی دیہ دوہو نہ ملی نیماتیتافتہ رنگ" جس کو اردو میں معشوق کہتے ہیں ہندی میں نایکا کہتے ہیں۔جس کی تعریف میں کہا جا رہا ہے۔اس کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ پہلے ششوتھی بچی تھی اس کے بعد بچپن کی جھلک

ابھی مٹی نہیں اور جوانی کا رنگ جھلکنے لگا ہے، تو ان دونوں چیزوں کو ملا کر اس میں ایک ایسی دمک آگئی ہے جیسے تافتہ ہوتا ہے۔ تافتہ تو فارسی کا ہے اور بہاری اس کا استعمال ابھی سے کر رہے ہیں لیکن اس طرح کا اس میں بیان آتا ہے "بترس لالچ لال کی مرلی دھری لکائے، سوم کہے بھونی ہنسے دین کہے نٹ جائے " یہ گوپی کی رادھا کا بیان ہے کہ اس نے کرشنا کی مرلی چرالی ہے، کیوں چرالی ہے کیوں کہ اب کرشنا مانگنے آئیں گے کچھ بات کریں گے تو بات کرنے کا مزا آئے گا، باتوں کا رس آئے گا بترس، لال مانے کرشنا لکائے مطلب چھپا دی ہے، بھونی ہنسے بھوہو سے ہنس رہی ہے، ہنسی چھپا رہی ہے، دین کہے کہتی ہے دیتی ہوں نتی جائے پھر مکر جاتی ہے یہ ایک دوہے میں ہے "بترس لالچ لال کی مرلی دھری لکائے، سوم کہے بھونی ہنسے دین کہے نٹ جائے "۔ ایک اور سناتا ہوں اسی طرح کا ہے، کہت، نٹت، ریجھت، کھجت، ملت، کھلت، لجیات، یہ سب چیزیں ایک لائن میں کر رہی ہے وہ، بھرے بھوم میں کرت ہے نینن ہی سو بات۔ اتنے لوگ پھیلے ہوئے ہیں پورے گھر میں، بول نہیں سکتی کیسے بات کرتی ہے وہ۔ 7 چیزیں ایک لائن میں کرتی ہے کہت، نٹت، ریجھت، کھجت، ملت، کھلت، لجیات۔ ایک میں آپ کو فرق بتاتا ہوں جو مجھے لگتا ہے چاہے غلط لگتا ہے بہاری کا جو معشوق ہے یہ دو فرق ہے ایک یہ ہے کہ یہ معشوق نہیں ہے رادھا جی ہیں، ہندی میں عشقیہ شاعری جو ہے بہت دن سے نہیں ہے جب اردو میں بہت بڑھیا شاعری لکھی جا رہی تھی ہندی میں نہیں تھی۔ ہندی میں بھکتی کویتا تھی۔ ہندی میں اگر آپ عشقیہ شاعری بھی لکھنا چاہتے ہیں تو بھکتی کے بہانے سے آپ لکھ سکتے ہیں۔ آپ یہ لکھتے ہیں کہ رادھا اور کرشن کا پریم ہے، اور اس بہانے آپ بتایئے آپ کو کیا بتانا ہے کیا دکھانا ہے؟ یہ روایت بہت دن تک رہی، کرشن بھگوان ان کے بنا پریم کویتا یا عشقیہ شاعری بنتی نہیں تھی ہندی میں تو اس میں کیا ہے "ہوری بارے میں ہے پھاگنی

بھیڑ اہیرن میں گہی گووندائے لگی بھیتر گوری" پھاگ چل رہا ہے، بھیڑ ہے بہت سے اھیر جمع ہوئے ہیں، اہیر کیوں جمع ہوئے ہیں کیوں کہ کرشن بھگوان بھی اہیر تھے، یادو تھے گوری مطلب رادھا جی کرشن بھگوان کو پکڑ کر گھر کے اندر لے گئی۔ "بھائی کہی من کی پد ما کر اوپر نائی ابیر کی جھوری" اور کرشن جی کی گوپی کے اوپر سر سے پوری ابیر کی جھولی ان کے سر کے اوپر سے نادی اس نے اور اس کے بعد کیا کیا" کھینچ پیتامبر کمر تے "وہ پیلا ریشمی کپڑا کمر میں لپیٹے ہوئے تھے، وہ پیلا کپڑا گوپی نے کمر سے کھینچ لیا" دو پٹا گئی مینڈ کپورن" یہ میرا خیال ہے اردو شاعری میں تھوڑا کم ہے وہ شریف لوگوں کی شاعری تھی۔ غالب میں کیا ملتا ہے کہ جب بہت خوش نصیب ہوا تو ایک آدھ بار معشوق کے پیر داب دئے۔ تو یہ فرق کیوں ہے اور آگے اس کا کیا مطلب نکلا؟ ایک چیز تو مجھے سمجھ میں آتی ہے کہ ہندی فلم کے اندر جتنے گانے لکھے جاتے ہیں وہ زیادہ تر اردو میں یا ہندوستانی میں ہی ہوتے ہیں، وہ ہندی میں کیوں نہیں ہوتے۔ بہت سے اس کے کارن ہیں کہ اگر ہندی میں پریم کے گانے لکھے جاتے تو ہر ایک فلم کے ہیرو بھگوان کرشن ہوتے اور ہیروئن رادھا جی ہوتیں۔ یہ اردو میں تو ہوسکتا تھا کہ کوئی بھی عاشق ہو جائے اور کوئی بھی معشوق ہو جائے، ہندی میں مشکل تھی اور اس کا مذاق بھی اڑایا گیا ہے ایک ہندی فلم کے گانے میں، جو ہے "یدی آپ ہمیں آدیش کریں تو پریم کا ہم شری گنیش کریں"۔

اردو کی جو پرانی پوری کی پوری جو کویتا کی روایت ہے وہ سیدھی ڈھل گئی فلم میں، اور اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ اردو میں خیال بھی تو پیش ہوتا ہے لیکن اگر فارسی کو تھوڑا سا دور رکھیں آپ تو زبان بڑی سادہ ہوتی ہے، تو وہ سب کی سمجھ میں آتی ہے، چلتی ہوئی تو ہوتی ہے، پھڑکتی ہوئی بھی ہوتی ہے جو فلم میں بڑی کام آتی ہے، اس میں چمتکار ہوتا

ہے۔ہندی کویتا میں چمتکار اس طرح کا نہیں ہوتا اس میں رس ہوتا ہے۔رس کے نام پر میں آپ کو آخری ایک Quotation سناتا ہوں بھارتیندو ہریش چندر کا، بھارتیندو ہریش چندر نے بھی برج میں لکھنا شروع کیا، کرشن کے بھکت تھے،لیکن 1837 میں جب اردو کو سرکاری زبان بنادیا(U.P) میں اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اردو سیکھی، جن کو ویسے نہیں آتی تھی ان کو سیکھنی پڑی،اس کے خلاف بھی بولتے رہے اور سیکھتے بھی رہے۔اگر سرکار سے کچھ چاہیے تھا تو Application بھی لکھتے تو اردو میں لکھتے۔ 1837 سے 1900 تک یہ حال چلتا رہا۔سب نے اردو سیکھی اور بہت سے لوگ اردو سیکھ کر شاعر بھی ہوگئے۔بھارتیندو ہریش چندر کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ بھی اردو میں شاعری لکھتے تھے اوران کا تخلص تھا رَضاؔ۔ان کے دوتین شعر آپ کو سناتا ہوں۔

کوئی جا کر کہو یہ آخری پیغام اس بت سے
ارے آجا ابھی دم تن میں باقی ہے سسکتے ہیں

نہ بوسا کرنے دیتے ہیں نہ لگتے ہیں گلے میرے
ابھی کم عمر ہے ہر بات پر مجھ سے جھجکتے ہیں

انھوں نے ایک اور غزل لکھی ہے جس کا ردیف قافیہ ہے" کرشن پیارا ہے"یہ پہلی لائن میں ہے۔اس کے بعد بات اور آگے بڑھتی ہے اس کا مقطع آپ کو سناتا ہوں۔

گناہ بخشو رضائی تو رضاؔ اپنے قدموں تک
براہے یا بھلا ہے جیسا ہے پیارے یہ تمہارا ہے

یہ اس کا مقطع ہے اور ایک اور شعر مجھے پسند آتا ہے ان کا،اس کا مطلب کس طرف جارہا ہے یہ پورا یقین نہیں ہے مجھے۔

بتِ کافر جو تو مجھ سے خفا ہے
نہیں کچھ خوف میرا بھی خدا ہے

تو یہ بھارتیندو ہریش چندر نے لکھا ہے، یہ غالب جب چلے گئے اس کے بعد کی بات ہے، تب تک بہت سے ہندوؤں نے اردو سیکھ کر اردو میں شاعری شروع کی اور بھارتیندو ان میں بہت پہلے سے تھے۔ اور بھی لوگ تھے، چکبست تھے لیکن بھارتیندو بہت شروع کے شاعروں میں سے تھے۔

اب میں اس کو ختم کرتا ہوں کہ اردو اور ہندی کا جو ملاپ ہے ایک طرح کا، غالب کے بہانے جس کا میں نے ذکر کیا آپ سے، اور دونوں زبانوں کی دونوں زبانوں کی عشقیہ شاعری کا جواز رہا ہے، کتنا اسی طرح کا تھا؟ کتنی باتیں ان میں دونوں میں پائی جاتی ہیں؟ کیا نہیں پایا جاتا؟ آخر میں یہ بات کہوں گا کہ ہم لوگ جو غالب کو اتنا نہیں سمجھتے جو اردو جانتے تو، پورا مطلب جب تک سمجھایا نہ جائے تب تک سمجھ میں نہیں آتا، لیکن پھر غالب کو یاد رکھتے ہیں پھر سنا سکتے ہیں، بہت سے اشعار سنا سکتے ہیں، جیسا اُگر نے کہا" کہ سمجھے بے سمجھے اسے زندگی بھر گنگناتے رہیں، ہمیں بھی لگاؤ ہے ایسا نہیں ہے"۔ تو ہمیں جو غالب میں مزا آتا ہے کچھ اس طرح کا آتا ہے کہ یہ سب بھی پڑھ کر ہم آئے ہیں، اور غالب کو ہندی میں اور ہندی کی کویتا میں لپیٹ کے پڑھنے کا جو سواد ہے، ذائقہ ہے جو مزا ہے وہ بہت ہے۔ ہمارے لئے غالب جتنے نئے ہیں وہ آپ لوگوں کے لئے ہو ہی نہیں سکتے جو بچپن سے ہی ہم اردو لکھتے، پڑھتے، بولتے، سیکھتے آئے ہیں۔ غالب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ Whisky جو پیتے تھے وہ تو آتی تھی Scotland سے۔ Scottish جس کے شوقین تھے وہ، لیکن اس میں گلاب جل ملا کر

پیتے تھے وہ، تھوڑا ادھر سے تھوڑا ادھر سے۔ تو ہم لوگ غالب کی شاعری جو Whisky ہے اس کو ہم بھی تھوڑا ہندی کا گلاب جل ملا کر پیتے ہیں، اور اس کا سواد کچھ اور آتا ہے۔ آخر میں ایک بات میں کہوں گا کہ جس طرح سے غالب کا ذکر ہے۔ کسی نے کہا کہ "مسلمانوں کی ہندوستان کو سب سے بڑی سوغات کیا ہے؟" ان میں ایک تھا غالب اور ایک کوئی چیز تھی۔ تو اس طرح سے جو بات ہوتی ہے وہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ اس طرح سے شعر ہوتے ہیں جن کو سن کر طبیعت پھڑکتی ہے مگر آپ دیکھیں اس کو سوچیں اس کے بارے میں تو بات اچھی نہیں لگتی اس کا مطلب کیا ہوا؟ ارے مسلمان کیا کوئی باہر کے لوگ ہیں جو ہم کو سوغات دیں گے۔ اپنے آپ کو سوغات نہیں دے سکتے وہ لوگ یہ کیا بات ہوئی۔ یہ باہری پن نہیں ہونا چاہیے۔ آج کل ہندی میں جو لوگ کویتا لکھ رہے ہیں ان میں سب سے بڑا نام پورن نارائن سنگھ کا ہے۔ بہت سے لوگ مانیں گے کہ اب جو شاعر ہیں ہندی میں کوی ہیں سب سے بڑا نام پورن نارائن سنگھ جی کا ہے، ان کی جو کویتا ہے " آج کل میری نفرت کرنے کی طاقت کم پڑتی جا رہی ہے ، میں انگریزوں سے نفرت کرنا چاہتا ہوں تو Shakespeare سامنے آجاتے ہیں، مسلمانوں سے نفرت کرنا چاہتا ہوں تو غالب آڑے آجاتے ہیں" یہ بات تو بہت بڑھیا ہے لیکن شاعر بڑھیا نہیں ہے۔ ارے غالب کو آپ مسلمان کیوں مانتے ہیں؟ غالب مسلمان تھے بھی اور نہیں بھی تھے وہ خود کہتے ہیں، وہ جب پکڑے گئے اور ان کی پیشی ہوئی جب سب مسلمانوں کو باہر کر رہے تھے، صرف ایک سوال پوچھتا تھا، تم مسلمان ہو، ہاں تو باہر۔ غالب سے بھی پوچھا وہ بولے، حضور آدھا، اپنے بچاؤ میں انھوں نے کیا بات کی، کیا نفاست پیدا کی، جب پوچھا کیسے تو بولے حضور شراب پیتا ہوں مگر سور نہیں کھاتا، بعد میں یہ بھی کہا کہ نماز کبھی کبھی پڑھتا ہوں شراب روز۔ تو اس طرح سے یہ کہنا کہ ان کو ہم مسلمان سمجھتے ہیں اور باقی لوگ ہندو۔ مجھے کیا لگتا

ہے کہ اس بات کو ہمیں اردو کے الگاؤ تک ہی سوچنا چاہیے ہندو مسلمان کی بات نہیں آنی چاہیے اس میں۔ غالب بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ ابھی آپ کو پتہ ہوگا کہ دنیا میں سب سے بڑا جو رسالہ نکلتا ہے شاعری کا Poetry Magazine، امریکا سے نکلتا ہے، اس میں اگلے سال ایک نمبر آنے والا ہے جس میں آج کل ہندوستان میں جو کویتائیں لکھی جا رہی ہیں وہ چھپیں گی۔ ایک ایک زبان سے ایک ایک شاعر کی کویتا۔ اس میں ہندی سے پورن نارائن جی کو لیا گیا ہے۔ ایک مدھومتا نام کی ان کی کویتا لی گئی ہے، اس کو ایڈٹ کر رہے ہیں انہوں نے اپنے Introduction میں لکھا ہے "ہندوستان میں ہندوستان کی سبھی زبانوں کو ملا کر اگر دیکھا جائے تو مرزا غالب کے بعد اس اعلیٰ درجے کا شاعر پھر ہوا نہیں ہے، جس کو ہم دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں کے سامنے کھڑا کر سکیں اور کہہ سکیں کہ وہ ہمارا ہے" اتنی بڑی بات کہی انھوں نے کہ غالب کے بعد ہندوستان کی کسی زبان میں اتنا بڑا شاعر نہیں ہوا ہے۔ وہ میرے دوست ہیں تو میں نے ان کو صلاح دی کہ بھئی ٹھیک ہے باقی سب لوگ تو مان جائیں گے مگر بنگالی کیا سوچیں گے۔ ان کے رویندر ناتھ ٹیگور ہیں ان کے اور لوگ ہیں ویسے بھی وہ نہیں مانتے ہیں، کسی کو تو تھوڑا سوچ لو کیا لکھ رہے ہو، تو انھوں نے یہ لکھا۔ لیکن غالب جیسی ہستی، غالب جیسے شاعر کو ہندی اردو کے کٹگھروں سے تھوڑا باہر نکالنا چاہیے۔ آج میں نے وہی کوشش کی۔ ہندو مسلمان تو دور کی بات ہے ہندی اردو کی ہی بات کریں۔ ہم نے ہندی میں پھڑکتے ہوئے غالب کو کس طرح پڑھا، کیا سوچ کر پڑھا، کس طرح کی چاشنی میں لپیٹ کر ان کو پڑھا اس کا تھوڑا سا میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا ہے

اور بازار سے لے آئیں اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے

یہ غالب نے بہت سوچ سمجھ کے کہا ہے اور اس کا میں نے ایک دوسرا ہی مطلب نکالا ہے۔ "پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے، تم بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" اردو میں بھی ہوگا اس کا مطلب یہی مگر ہندی میں مجھ کو پہلی بار پڑھنے کو ملا۔ انھوں نے کہا ہے کہ وہ پوچھ رہے ہیں کہ غالب کون ہے اس کا مطلب یہ تھوڑی نہ ہے کہ غالب نام کا آدمی کون ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو غالب کہتے ہو لیکن تم پہ ہم غالب ہیں بتاؤ غالب کون ہے؟" اور بازار سے لے آئیں اگر ٹوٹ گیا، ساغرِ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے" اس کا مطلب میں نے یہ نکالا ہے کہ ساغرِ جم جو ہے جس کو ہم جامِ جمشید کہتے ہیں، جو ایران میں تھا جادوئی تھا جس میں وہاں کے بادشاہ جب چاہتے تھے پوری دنیان کا حال دیکھ لیتے تھے۔ جیسے کہ SatelliteTelevision ہو Breaking News ہو، سب ظاہر ہو جاتا تھا، تو اس سے اچھا اب کیا ہے وہ تو ایران میں تھا، اب جو مٹی کا بنا ہوا پیالہ ہے، جو کلھڑ ہے وہ اس سے اچھا ہے۔ جامِ جمشید تو توران ایران میں رہ گیا۔ فارسی جہاں سے لائے تھے غالب وہیں رہ گئے، لیکن اب ہندوستان کی مٹی سے بنا ہوا پیالہ زیادہ اچھا لگتا ہے کیوں کہ بدلنے میں تو وہی کام آئے گا" اور بازار سے لے آئیں اگر ٹوٹ گیا، ساغرِ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے"۔ تو غالب جو ہیں جامِ سفال تک پہنچتے پہنچتے ہم لوگوں کے ہندی والوں کے اتنے قریب آچکے تھے کہ وہ ہندی والوں کو بھی اتنے ہی عزیز ہیں جتنا کہ اردو والوں کو۔

***

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب

صدارتی تقریر سے ماخوذ

چند لوگوں کا خیال ہے کہ غالب شروع میں مشکل لکھتے تھے اور بعد میں آسان لکھنے لگے۔ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ غالب مشکل لکھنا ہی نہیں جانتے تھے۔ اصل میں وہ کم لفظوں میں زیادہ کہنا چاہتے تھے۔ نئے نئے طریقوں سے پیش کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ موضوع کو چھوٹے لفظوں میں کہہ کر پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس میں ان کو مشکلیں زیادہ پیش آئیں۔ غالب نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں کہنا شروع کیا خاص طور سے برطانوی اثر میں اور پچیس چھبیس سال تک انھوں نے کہا، پچیس چھبیس سال کی عمر کے بعد ہوا یہ کہ ان کے معاصرین میں جو شاعری کا رواج تھا وہ بہت سادہ رواج تھا زبان کی شاعری، محاورے کی شاعری کا۔ لیکن زندگی کے پیچیدہ تجربات کا ان کو کوئی علم نہیں تھا۔

غالب نہ صرف شاعر ہے بلکہ ایک عہد ساز شاعر ہے۔ غالب کے دور کا جو ٹیلینٹ ہے یہ وہ ٹیلینٹ نہیں ہے جو مغل دور کا ٹیلینٹ تھا۔ غالب کے دور میں برطانوی راج کا ٹیلینٹ شروع ہو چکا تھا۔ غالب نے انگریزی تہذیب کو بھی دیکھا۔ کلکتہ گئے اور کلکتہ کا جو ذکر کیا ''تو نے ہم نشیں، اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے''۔ ایک بڑی

دلکش نظم لکھی۔ کلکتے گئے راستے میں بنارس کو دیکھا۔ وہاں سے متاثر ہوئے اور مثنوی ''چراغ دیر'' لکھی کہ شاید ہی اتنی خوبصورت نظم اس دور کے کسی زبان کے کسی شاعر کے پاس ملے۔

غالب ہر چیز کے بارے میں ایک بڑی معروضی نظر رکھتے تھے۔ غالب غزل کے شاعر ہیں اوران کی جو آزادی ہے وہ یہ ہے: "میں نے تو اپنے ایمان کو اپنے ہاتھ کا کھیل بنالیا ہے۔ پتھر سے بت تراشتا ہوں پوجا کرتا ہوں۔ غالب کے پاس ایسی بہت سی چیز ہے مذہب کے تعلق سے۔ ان کا رویہ بہت ہی تیز تھا۔ وہ زندگی میں کسی ٹھہری ہوئی چیز کو مانتے نہیں تھے اوران کی فکر کو ہم کسی کلاسیکی شاعر اوران کے ماں باپ سے ملا نہیں سکتے تھے کیونکہ غالب کے پاس جو حرکت جو روانی جو گریس ہے وہ کسی اور شاعر کے یہاں ملتا ہی نہیں ہے۔

میرے پاس جو عجوبہ آجاتا ہے اس کو میں گزار دیتا ہوں اور کعبے پر نظر پڑتی ہے تو اس کو بھی نقش پا کہتا ہوں۔ جو ان کے پاس روانی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کعبے کو نقش پا کہنے والا کافر ہے یا غالب اس مضمون کو اچھا نہیں کہہ سکتے۔ فانی نے اس کو اچھا کہا کہ ''تو کہاں ہے کہ تیری راہ میں یہ کعبہ و دیر نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے۔'' یہ مسائل غالب کے سامنے تھے اور وہ اس کے اوپر ایک ناقدانہ نقطہ نظر بھی رکھتے تھے۔

غالب انگریزی تہذیب سے کیسے متاثر ہوئے وجہ خود موجود ہے۔ غالب کلکتے کا سفر کرتے ہیں اس کا اثر ہے۔ ولیم فریزر کے ساتھ ان کی صحبت کئی برس رہی ہے اور اس کے بعد سر سید کے آئین اکبری کی تقریظ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے نئے دور کا کس شان کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور ان کی فکر نئے زمانے کی رقیب بنی جس کا اثر بعد میں سر سید اور اقبال سب کے اوپر پڑا۔ اور یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جسے ہم بھی نہ سلجھا پائے

کہ مغربی روایات اور مشرقی روایات اور اس دور میں جب کہ آپسی تمدن بڑھتا جارہا ہے۔ یہ سمجھنا کہ میرے محلے کی چیز یا میری مٹی کا کلہڑ ہی اہم ہے، یہ نہیں ہے۔ کب آپ کلہڑ کے بعد پیپر کپ پر آجائیں گے۔ اگر ہم ماضی کی طرف جائیں تو پھر کبھی آگے بڑھ نہیں سکتے۔

اس کے بعد غالب کا دوسرا دور ہے جو ہندوستانی شاعر ہے۔ انھوں نے اردو کے بعد فارسی لکھی اور 1826 کے بعد وہ فارسی میں ہی لکھتے رہے۔ غالب نے چودہ سال کی عمر سے چھبیس سال تک جو اٹھارہ سو شعر لکھے آج وہی اٹھارہ سو شعر ان کا سرمایہ ہے۔ اس کا نام دنیا کی ہر زبان میں لیا جاتا ہے۔ وہ اتنا مختصر ہے لیکن آج بھی ہم اس کو پوری طرح سے حل کرنے میں ناکام رہے ہیں وہ اس لیے کہ مشکل تو اس کو کہیں گے جو نااہل تھا۔ غالب کے یہاں تو نااہلی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ غالب جو بات کہہ رہا تھا اس کو سمجھنے کے لیے آج بھی اس کے جو طالب ہیں اور بہت سے مسائل اور نئے نئے پہلو اس میں ہمارے سامنے آئیں گے۔

قصہ یہ ہے کہ توحید کا پیام ہر مذہب کی روح ہے اور ہندو مذہب میں بھی جو توحید کا پیام ہے اس کو لوگوں نے لیا ہے۔ غالب نے لیا ہے۔ میر نے لیا ہے۔ سب کے پاس موجود ہے۔ بلکہ بعض ہمارے صوفیانہ مکاتب بھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ یہ تو ہونا ہی چاہیے پر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ مجھے السلام وعیکم کہیں تو میں ان کو مسلمان کہوں بلکہ ایک بڑی تہذیب ہندوستان کی جو سب سے بڑی پھیلی ہوئی تہذیب ہے وہ یقیناً ہندو تہذیب ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے مجھے کیرل کے ایک دواخانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں رات چار بجے مندر کی گھنٹی بجتی ہے۔ دواخانے میں شلوک پڑھے جاتے ہیں۔ کچھ میں سمجھتا تھا کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ بڑا روحانی ماحول رہا۔ یہ ماحول آج سے پہلے رہا

ہوگا اور اس ماحول کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ لوگوں نے اعتراض اٹھائے، طریقے الگ الگ ہیں۔

غالب کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کے پاس پرانوں کے اپنشد کے تصورات کا عکس ہے، یقیناً ہوگا، کیوں نہیں ہوگا لیکن اس کی وجہ سے ان کے اوپر کوئی ٹھپہ نہیں لگایا جاسکتا۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ باخبر ہے۔ وہ کبھی آپ کے احساسات کو محسوس کررہے ہیں۔ کبھی مغرب کے احساسات کو محسوس کررہے ہیں۔ اور یہ کیفیت ان کے اندر جو ہے اس سے وہ مختلف چیزوں سے متاثر رہے ہیں۔

میں نہ ادب کا طالب علم ہوں نہ تحریر کا طالب علم ہوں۔ ایک چیز یہ ہے کہ ہندوستان میں جو مسلم حکمران آئے ہیں اس وقت سارے مذہبی صحیفے ان کے ہاتھ میں تھے۔ یہ جو دیوناگری تھی دیوں کے لکھنے کا رسم الخط تھا۔ ہم جیسے گنہگاروں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برہمن نے جس طریقے سے رسم الخط اپنے یہاں بند رکھا اور اس کو مذہب کی حد تک محفوظ رکھا۔ ہندوستان کے اندر یہاں کے مسودات کو مجھے سروے کرنے کا موقع ملا پورے ملک کا نہیں بلکہ جنوبی ہند کا۔ تقریباً ڈیڑھ ملین مسودات کے ہم نے سروے کیے۔ جتنے Manuscripts ملے رامائن، مہا بھارت کے، اپنشد کے، یہ کرناٹک، تیلگو، ملیالم اور سنسکرت میں تھے۔ بعد میں ان کے ترجمے ہوئے۔ ان مذہبی صحیفوں میں یہ تقریباً 96% تھے۔ 1.4% میں کچھ میڈیکل کے تھے اور کچھ سنسکرت واستوشاشتر کے۔

ملک محمد جائسی کے جہاں جہاں حوالے ملیں گے یہ سب چیزیں لکھی گئی ہیں جن کو ہم ہندی کہتے ہیں۔ یہ یقیناً زبان کے لحاظ سے ہندی کے ہیں لیکن لکھی گئی ہیں فارسی رسم

الخط میں۔ لکھی اس لیے گئی ہیں کہ رسم الخط کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ ایک ہزار سال یا آٹھ سو سال کی غفلت کے بعد ہم آج اچانک اٹھے ہیں۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ جو علم ہو وہ کھلے دل کے ساتھ آئے۔ آٹھ سو سال تک اردو کو سکھ مذہب کو، اسلام کو، عیسائی مذہب کو اردو نے سہارا دیا۔ میں نے لندن جیسے شہر میں اردو کی کتابوں کی نمائش کی اور وہاں دیکھا تو اتنے ترجمے گیتا کے، اپنشد کے، مہابھارت کے اردو اور فارسی میں ملے۔ اتنے ترجمے تو اور کسی زبان میں نہیں ہیں۔ گروگرنتھ صاحب اور سکھ لٹریچر فارسی میں ملا۔ فارسی رسم الخط میں ملے۔ فارسی کے بعد اردو کا نمبر آیا۔ فارسی کی لغت غالب سے پہلے ٹیکھنڈ بہاری نے تیار کی۔ آج بھی اس کا جواب نہیں ہے۔ فارسی کی لغت سے ہٹ کر میں سمجھتا ہوں سب سے بڑی لغت فرہنگ آنندراج ہے جو کافی تفصیلی ہے۔ یہ کام سب نے مل کر کیا ہے۔ یہ مہم سب کی تھی۔ یہ مہم اس لئے نہیں تھی کہ باہر سے رسم الخط لا کر ہم پر تھوپا گیا تھا بلکہ یہ تھا کہ گھر کے اندر جو رسم الخط تھا اس کو چھپا لیا گیا تھا اور اس زبان نے اس رسم الخط نے آکر سب کی خدمت کی ہے۔ اب اس کے اندر مسلم اور اردو کا فرق مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو آنندراج کی کرم بھی دیکھتا ہوں۔ ٹیکھنڈ بہاری کو بھی پڑھتا ہوں اور چندر بھان برہمن کو بھی پڑھتا ہوں اور اسی کی وجہ سے مجھے گیتا اور رامائن کو پڑھنے کا موقع ملا ورنہ تو سنسکرت کب سیکھتا اور پڑھتا۔

اب اتنے برس بعد ہندی رسم الخط کا احیا ہو رہا ہے۔ بہت سی وجہ ہے۔ یہ رسم الخط ہندوستان کا آسان ترین رسم الخط ہے جو ہر شخص سیکھ سکتا ہے۔ بچہ بچہ سیکھ سکتا ہے اور ہندوستان کی دوسری زبانیں جیسے تمل ہے، ملیالم ہے، تیلگو، مراٹھی، گجراتی، بنگالی ساری زبانوں کی لکھاوٹ کا ایک ہی سسٹم ہے۔ حروف کی آواز اور ترتیب میں تھوڑا فرق

ہے۔ پر اس ملک کے لئے وسیع پیمانے پر تعلیم کے لیے ہندی رسم الخط سے بہتر اور کوئی رسم الخط نہیں ہے۔ زبان اگر شدھ رہنے کی کوشش کرے گی تو سکڑ جائے گی۔ زبان اس وقت بڑھتی ہے جب دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے ساتھ لیتی ہے۔ اردو کی ترقی کا راز یہی ہے کہ اردو نے مختلف زبانوں سے الفاظ لیے ہیں۔ فارسی ضرورت کی زبان تھی جب اس کی ضرورت ختم ہوگئی تو ہندوستان کی اپنی بنی ہوئی زبان اردو نے جگہ لے لی۔ اردو میں فارسی عربی کے الفاظ اب تو انگریزی کے بھی بہت سے الفاظ آرہے ہیں لیکن اردو کے سارے فعل سب سنسکرت اور ہندی کے کامن ہیں۔ کسی زبان کی ریڑھ کی ہڈی اس کا فعل ہوتا ہے۔ اردو میں آنا، جانا، کھانا، بیٹھنا، سونا کوئی ایسا فعل بتایئے جو ہندی کا نہ ہو۔ ہندی اردو جڑی ہوئی زبانیں ہیں جس کی ایک ہی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ایک ہی زبان بولتے ہیں لیکن اردو کا دروازہ کھلا ہے جس مین اور بھی مختلف زبانوں کے الفاظ آتے ہیں جس کی وجہ سے اردو میں خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

غالب کہتے ہیں کہ گل کھلے، گل فارسی کا ہے، غنچے چٹکنے لگے، چٹکنے لگے ہندی کا ہے اور صبح ہوئی، صبح عربی کا ہے، ہوئی ہندی کا لفظ ہے۔ یہ جو الفاظ اردو کے اندر آئے ہیں ان الفاظ کی وجہ سے اردو میں خاص خوبصورتی اور معنویت پیدا ہوگئی ہے۔

ترجمہ ایک بڑا کام ہے۔ دوسری زبانوں میں ترجمہ کیجیے۔ دوسری زبانوں میں، انگریزی زبان میں غالب کو سمجھایے۔ ہندی کو الگ زبان سمجھ کر سمجھانے کی کوشش کریں گے تو بڑی محنت لگے گی جیسے بہت بڑا کام ہے۔ اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہے۔ ہم کو چاہیے کہ ہندی کے الفاظ اردو میں بڑھاتے رہیں۔ سوسائٹی میں جسے جس الفاظ کی ضرورت ہوگی وہ لے لے گا اور جسے ضرورت نہیں ہوگی وہ چھوڑ دے گا۔ سوسائٹی بدلتی رہے

گی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ماضی سے پرانے الفاظ لائے جائیں اور اس میں ایک ترجمے کو زندہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ کچھ لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ کوشش ایسی صدی میں ہو رہی ہے جس میں نئی نسل چاہے ہندو ہو یا مسلمان آسان زبان استعمال کرنا چاہتی ہے۔ میں نے ایک بات سیکھی ہے کہ بات آسان زبان میں کی جانی چاہیے۔

***

اس شمارے کے قلم کار حضرات :

1- پروفیسر ہریش ترویدی، سی-12، یونیورسٹی فلیٹ، 31-29، پروبین روڈ، دہلی-7

2- ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، لندن

3- پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، 271، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

4- پروفیسر شمیم حنفی، 114بی، ذاکر باغ، نئی دہلی-25

5- ڈاکٹر خالد جاوید، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-25

6- ڈاکٹر ارجمند آرا، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-7

7- ڈاکٹر شکیل اختر، ماس کمیونیکیشن، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-25

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

غالب اور عصر حاضر

غالبیات کے سرمائے کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ عصر حاضر میں گو کہ غالب کے متعدد اشعار بار بار مختلف صورتوں میں استعمال کیے گئے ہیں مگر دو اشعار ایسے ہیں جنھوں نے خاص طور سے توجہ حاصل کی ہے۔ایک تحریر ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اور دوسرا یہ۔

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں

اس کے علاوہ پوری غزل جو موسیقاروں نے بار بار گائی ہے ''دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے'' اس کے یہ اشعار۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

یہ سب اشعار عہد حاضر میں اپنی مقبولیت کی آپ شہادت ہیں۔ ہر شعر کسی نہ کسی سوال کے ذریعے ذہن کو ایک ایسے منطق میں لے جاتا ہے جہاں پر سوال اپنا جواب پانے کی بجائے نئے نئے سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ خلاؤں میں گھومنے اور نئی جہتوں میں گھومنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اشعار میں الفاظ کا اپنا نغمہ شروع ہی سے اپنی گرفت کو مضبوط رکھتا ہے۔ مگر ان اشعار کی طرف ہم تھوڑی دیر بعد میں آئیں گے۔ پہلے غالب کی شاعری سے متعلق کچھ اور باتوں کی طرف دھیان جاتا ہے جو اسی سلسلے میں بہت اہم ہیں۔

کہا جاتا ہے اور درست بھی ہے کہ الفاظ جو بظاہر ساکت و جامد لگتے ہیں اور ان کے معنی لغت میں قید ہوتے ہیں وہ ایسے بے جان نہیں ہوتے۔ ان کے اندر ایک تحرک ہوتا ہے جس کی بنا پر وقت گزرنے کے ساتھ خود الفاظ کی ان کے معانی اور تلازمات کے ساتھ نشو ونما ہوتی ہے۔ اور ان کی اس نشو ونما میں الفاظ کو استعمال کرنے والوں کے ذہنوں کی نشو ونما بھی شامل ہوتی ہے یعنی شعر وادب کو پڑھنے والے اس کے الفاظ میں بہت کچھ وہ دیکھ سکتے ہیں جو ان سے پہلے لوگ یا تو نہیں دیکھ سکتے تھے یا انھوں نے انھیں کسی اور طرح دیکھا تھا۔ خود شاعر کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے بعد اس کی شاعری کی طرف لوگوں کا رویہ کیا ہوگا۔ اس کے استعمال کیے ہوئے الفاظ کو خود ان کے جانے بوجھے مفاہیم کے علاوہ دوسرے الفاظ کی بنائی ہوئی فضا میں کس طرح سمجھا جائے گا۔ شاعر نے جو کچھ بھی

محسوس کیا ہوگا اور کہا ہوگا وہ اس کے اپنے زمانے اور زندگی کے حدود کے اندر رہتے ہوئے کیا ہوگا۔ تو پھر آج ہم اس کو اس کے سارے منظر و پس منظر سے الگ کر کے کیوں دیکھتے ہیں اور کس طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بعض اوقات غالب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے یا وہ وقت سے بہت آگے تھے۔ اس لئے ان کے زمانے نے ان کی مناسب قدر نہیں کی۔ سمجھا تک نہیں گیا۔ وہ آفاقی شاعر ہیں اور ہر زمانے کے شاعر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں میں اس حد تک تو سچائی ہے کہ غالب کے کلام کی داد و تحسین ان کے بعد پہلے سے زیادہ ہوتی رہی ہے اور آج وہ ہمارے سب سے مقبول شاعر ہیں جب کہ ان کے کلام کا بڑا حصہ فارسی آمیز ہے اور جہاں زبان سادہ ہے وہاں بھی معنی تہہ بہ تہہ ہیں۔

کسی شاعر کو اس کے عہد سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور بڑے شاعر کی بڑائی میں بنیادی پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے سب سے باخبر اور باشعور لوگوں میں سے ہے۔ اس کے کلام کی عصریت میں ہی دراصل اس کے دوام کے سرچشمے ہیں۔ غالب کے کلام میں ایک بے چین شخصیت اور پیچ در پیچ اندازِ فکر اور جذبے کی وہ شدت ہے کہ بقول خود ان کے۔

آب گینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

ان سب کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے سارے انتشار اور بحران کو نہ صرف دیکھ رہے تھے بلکہ اس کا خود شکار تھے۔ لال قلعہ میں محدود شہنشاہیت سے لے کر اس اشرافیہ تک جو قلعے سے وابستگی کے ساتھ ساتھ نواب ریذیڈنٹ بہادر کی بھی دست نگر ہوتی جا رہی تھی۔ سب کسی نہ کسی شدید فرود میں مبتلا تھے۔ غالب کے مزاج کی ساخت بھی ان ہی حالات میں ہوتی تھی۔ ان کے خطوط اور شاعری کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے

حاشیے کے طور پر پڑھا جائے اور ان کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات و حادثات کو غور سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں رہ جائے گا کہ انیسویں صدی میں تاریخ کے ایک عبوری دور کے سب سے معتبر نمائندوں میں ہیں۔ وہ غزل سامنے رکھیے جس کا پہلا شعر ہے۔

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

یا یہ اشعار۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

غرض کہ اس عہد کی تاریخ کا کوئی بھی جائزہ غالب کی فراہم کی ہوئی شہادتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ انگریز حکام سے ان کے معاملات، قلعے کے اندر کی زندگی، دہلی شہر کے حالات، 1857 کے واقعات، دہلی سے کلکتے تک کے سفر کی تفصیلات، کلکتے کے تجربات، پینشن کے سلسلے کی پریشانیاں، سب مل کر ایک ایسے شخص کی کہانی کہہ رہے ہیں جو

اپنے عہد کی سچائیوں کا بھرپور اندازہ رکھتا ہے۔

غالب کے عہد کے مورخین نے لکھا ہے کہ ان کے عہد کی دہلی کی زندگی نہ صرف پرسکون تھی بلکہ اس میں ایک عارضی چمک دمک تھی۔ مشاعرے، رقص وموسیقی کی محفلیں، پھول والوں کی سیریں، میلے، تماشے، تہواروں کے جشن، قلعے کے اندر سب کچھ ختم ہوجانے کے باوجود عیش وعشرت کے پورے سامان۔ ادھر شہر میں دہلی کالج جیسے ادارے کی بدولت نئی ابھرنے والی نسل کے لئے حوصلوں اور امیدوں کی کرنیں، غرض کہ ایک چکا چوند کا عالم تھا۔ مگر غالب کے خطوط اور ان کی شاعری کو دیکھیں تو سطح کے نیچے نیچے ایک طوفان بن رہا تھا۔

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

سوال یہ ہے کہ ایسا شخص جس کے پاؤں اس قوت کے ساتھ اپنی زمین میں جمے ہوئے ہوں وہ آنے والے زمانوں میں جب کہ وہ سب کچھ بدل چکا ہے، کیسے اپنے پڑھنے والوں کے ذہن کو اس قدر متوجہ کرسکتا ہے۔

غالب کے عہد سے پہلے اور خود غالب کے زمانے میں تصوف کا بڑا اثر تھا اور ہماری شاعری میں تصوف کا جو پہلو حاوی تھا وہ تھا انسان کا مجبور و بے اختیار ہونا۔ شاعری کی حد تک تصوف کا یہ زور غالب کے عہد کے بعد کم ہونا شروع ہوا اور بیسویں صدی میں ایک دو شاعروں کے سوا کہیں نظر نہیں آتا اور جن کے ہاں ہے بھی مثلاً اصغر، وہاں انسان کی مجبوری اور دنیا کی بے ثباتی پر وہ پہلا سا زور نہیں۔ دوسرے پہلو زیادہ حاوی ہیں۔ غالب کے یہاں بھی تصوف کے مضامین کے ساتھ ساتھ اس پر بھی بنیادی سوال ملتے ہیں۔

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
پھر کیا ہے تو اے نہیں ہے

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

تھک تھک کے ہر مقام پر دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

غالب کے عہد سے پہلے کے شاعروں نے افراتفری، خانہ جنگی، بے دری و بے وطنی کا دور دیکھا تھا۔ جس کا اظہار میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے کلام میں زیادہ نمایاں تھا۔ اس کے برعکس غالب نے زمانہ تو وہ دیکھا جو بہ ظاہر امن و آشتی اور سیاسی Stability کا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ خود ان کے جو تجربات تھے وہ اس ظاہری صورت حال کی تصدیق بھی نہیں کرتے تھے۔ پھر انگریزوں کے ذریعے آنے والی نئی تہذیبی لہروں کے ذریعے نئی سمتوں میں بھی اشارے ہو رہے تھے جس کا اندازہ غالب کو بھی تھا اگرچہ اس کے نتائج جو 1857 میں ہوئے کسی پر بھی پہلے سے ظاہر نہیں ہو سکتے تھے۔

ان حالات میں غالب کی شخصیت کو سب سے بڑا تحفظ ان کو اپنے اس ذہن سے ملا جس نے انھیں تمام عمر ستائے بھی رکھا۔ غالب کے بعض اشعار ان کی ایسی ہی کیفیات کو طرف اشارہ کرتے ہیں۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا یہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

روزمرہ زندگی کی وہ سچائیاں جو ان کے خطوط میں تفصیل کے ساتھ آتی ہیں شاعری تک آتے آتے ان کے ذہن میں تجریدی عمل سے گزرتی ہیں۔ تجریدی انداز فکر اور طرزِ اظہار قاری کے ذہن کو ایک ایسی سطح پر لانا اور اس سے مخاطب ہوتا ہے جس کی بنیاد تو زندگی کی حقیقتوں پر ہے جو وہیں تک محدود نہیں رہتیں بلکہ ان سے نتائج اخذ کر کے نئی جہتوں میں لے جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عصریت ان کے پیروں کی زنجیر نہیں بن جاتی بلکہ حیات وکائنات کے ان رازوں کی جستجو کی طرف مائل کرتی ہے جو ہر عہد کے انسان کا مسئلہ ہیں۔ اسی تحریری طرزِ فکر واظہار کی بدولت وہ اپنے بعد آنے والے لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی تجریدی طرز فکر کے سبب وہ ابہام اور لفظوں کے درمیان چھپی ہوئی کچھ پراسرار خاموشیاں گونجتی ہوئی ملتی ہیں جو ہر زمانے میں غالب کی تفہیم کے سلسلے میں تشریح و تعبیر کے مسائل سامنے لاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سے لطف اندوزی، اس کے شعری حسن اور دلکشی کے علاوہ عصرِ حاضر کے ذہنوں کے لئے ایسے دریچے کھولتی ہیں کہ ان کی وسعتیں سامنے آجاتی ہیں۔ چنانچہ غالب کے اشعار کے ذریعے ہم ایسے جمالیاتی تجربات سے گزرتے ہیں جس میں الفاظ، بحروں اور ردیف و قافیے کے نغمے کے ساتھ ایک وژن اور ایک تحیر وتجسس اس دنیا کے آفاق سے پرے کہیں پہنچنے کی تمنا کو جنم دیتا ہے۔ غالب کی شاعری کا یہی Rythm ہے جو لازوال ہے اور جس کی بازگشت زمان ومکان کی حدوں میں قید نہیں رہ سکتی۔

اب ان دو اشعار کی طرف پھر توجہ کریں تو محسوس ہوگا کہ تمنا، اس کا دوسرا قدم

دشتِ امکاں اور نقش پا سب مبہم ہیں اور ابتدا ہوئی کہاں کے ذریعے ایک بڑا سوالیہ نشان ان الفاظ سے متعلق ابہام کو اور زیادہ گہرا کر دیتا ہے۔ غالب کے نزدیک اس شعر کی اہمیت کیا تھی اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ ان کے متداول دیوان سے یہ نکال دیا گیا تھا اور نسخۂ حمیدہ کی اشاعت کے ساتھ نمودار ہوا۔ مگر اس کے بعد بھی بہت دن تک اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ مگر گزشتہ تقریباً پچاس برس میں اسے بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ شعر بہت سی وضاحتیں لے کر آیا ہے کیونکہ آج کا انسان جہات و کائنات کے اسرار کی جن پُر پیچ راہوں سے گزر کر انھیں افشا کرتا ہوا نئی دریافتوں کی بدولت نئی آگاہیاں حاصل کر چکا ہے اس کی بنا پر کم از کم 'دشتِ امکاں' اور اس کی بے کرانی سے تو وہ آشنا ہو چکا ہے مگر پھر بھی یہی بے کرانی اس کے سامنے تمنا کے دوسرے قدم کے بارے میں پریشان کرتی ہے۔ زندگی کا کارواں جس منزل پر پہنچا ہے ابھی زیادہ سے زیادہ اسے دشتِ امکاں میں پہلا قدم ہی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے قدم تک کتنا فاصلہ ہے اور وہ ہوگا کہاں پر اس کی کسی کو خبر نہیں۔ لیکن سفر جاری ہے۔ سفر کی تھکان بھی بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ شدائد سے نبرد آزما ہونے والوں اور تھک کر نہ بیٹھنے والوں کی ایک فریاد ہے ورنہ یارب کہہ کر خدا کو مخاطب کرنے کا کوئی اور سبب نہیں تھا۔ آج کی دنیا میں انسان سائنس اور دوسرے علوم کی ہر گھڑی نئی دریافتوں اور زندگی پر اس کے اثرات کے نتیجے میں جس قدر ششدر ہے اور ساتھ ہی ساتھ سامنے کی طرف بھی حیرت سے تک رہا ہے اس کی بنا پر یہ شعر ڈھارس بھی دیتا ہے اور آگاہی بھی۔ اور اسی وجہ سے آج یہ شعر سب سوچنے والے ذہنوں کے لئے ایک خاص کشش رکھتا ہے۔

دوسرے شعر میں گرمیٔ نشاطِ تصور نغمہ سنجی اور عندلیب گلشن کی تراکیب پہلے شعر کے مقابلے میں زیادہ مانوس ہیں کیونکہ گلشن اور عندلیب کی نغمہ سنجی اردو اور فارسی شاعری میں بارہا آتی ہے۔ پہلے شعر کے الفاظ ہیں تو عام مگر غالب نے انھیں کچھ اس طرح برتا ہے کہ وہ

سب بالکل نئے بلکہ اتنے اجنبی سے ہوگئے ہیں کہ وہ ہمیں بار بار سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔مگر دوسرے شعر میں پہلے تو گلشن ناآفریدہ اور پھر خود کو استعارہ اس کا عندلیب قرار دینا ہی سارے سوالات کا سرچشمہ ہے۔ وہ گلشن جو ابھی وجود میں بھی نہیں آیا اس کے لئے جو عندلیب نغمہ سنج ہوسکتا ہے وہ ہمارے لئے کسی ان دیکھے، ان جانے نشے کی سرمستی میں سرشار ہے۔ اگر چہ خود اس نے اپنے تصور کے ذریعے اس گلشن ناآفریدہ کو پالیا ہے۔ پہلے شعر میں 'ہم' کے لفظ کی جو عمومیت تھی اس میں ہم آپ سب شامل تھے۔ دوسرے شعر میں اس کی جگہ 'میں' کہہ کر غالب نے اس انا کا اظہار کیا ہے۔ جو کسی اور کو نغمہ سنج کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہ نغمہ سنجی کسی نشاط انگیز تصور کے سبب ہے۔ باہر کی دنیا کے واقعات وحادثات کی بدولت تو ہر طرف خرابی ہی خرابی ہے۔ یا کہیں کوئی پھول پتی ہو بھی تو وہ ان جیسے عندلیب کو نغمہ سنجی پر اکسانے کے لئے ناکافی ہے۔ مگر تصور کی نگاہیں کسی ایسی دنیا میں پہنچتی ہیں جس کا ابھی تک کوئی وجود ہی نہیں۔ مگر کہیں نہ کہیں اس نوشادابی اور بہار کو تصور نے اس طرح دیکھ لیا ہے کہ عندلیب سرمست وسرشار ہے۔ جہاں یہ پتہ نہیں چلتا کہ گرمیٔ نشاطِ تصور نے گلشن ناآفریدہ کو خلق کیا ہے یا گلشن ناآفریدہ کے سبب گرمیٔ نشاطِ تصور ہے۔ گلشن ناآفریدہ بھی دشتِ امکاں کی طرح لامتناہی ہونے کے سبب آج کے ذہن کے لئے تصورات کی دنیا کے وہ سارے پٹ کھول دیتا ہے۔ یہ نشاط آخر میں اس لئے ہے کہ وہاں وہ سب کچھ ہے جو اس خزاں زدہ دنیا میں نہیں۔

مختصر یہ کہ غالب اگر اپنے عہد کے بعد زیادہ سے زیادہ مقبول ہوئے ہیں تو اس کا سبب ان کی تجریدی فکر اور اس کے سبب ان کے اشعار میں ابہام کے ساتھ ساتھ وہ Spaces ہیں جو ہر پڑھنے والے سے مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ خود انھیں پر کریں۔

***

پروفیسر شمیم حنفی

غالب اور ہمارا عہد

شاعری میں بیسویں صدی اقبال کی صدی تھی۔ فکشن میں اس حقیقت کے باوجود کہ پریم چند تخلیقی ادیب اور ادب کی عظمت کے ایک مسلمہ ترجمان بن گئے تھے۔ بیسویں صدی کے متنازعہ پر پیچ اور خیر و شر کی قوتوں کے ایک متحدہ نشان کے طور پر یہ صدی منٹو کے واسطے سے پہچانی جاتی ہے۔ اقبال نے ہمیں بتایا کہ بیسویں صدی کا انسان اپنے کھوئے ہوئے امکانات کی تلاش میں ہے اور منٹو نے ہمیشہ یہ بتایا کہ انسان اپنے لئے ایک مسئلہ کیوں بن گیا ہے۔

اس پس منظر میں ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اقبال اور منٹو دونوں نے اپنی تخلیقی روایت کے ماضی سے غالب کو ایک علاحدہ مظہر کے طور پر کیوں دیکھا اور غالب کو اپنی فکر اور اپنی عام انسانی صورت حال کے حوالے سے سمجھنے کی جستجو کیوں کی۔ اقبال کے لئے غالب کی فکر انسانی تخیل کی انتہاؤں کا اشاریہ ہے۔ منٹو کے لئے غالب گنجینۂ معنی کا طلسم۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر غالب کو عقیدت کا خراج ادا کیا ہے اور دونوں کے جائزے سے یہ سچائی نمودار ہوتی ہے کہ غالب کی فکر اور ان کی شخصیت ہمارے اپنے عہد کے

مطالبوں اور تقاضوں سے عہدبرآ ہونے کی عجیب وغریب طاقت رکھتی ہے۔

سر شیخ عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچے میں اقبال کو غالب کی روح کے دوسرے پیکر سے تعبیر کیا ہے اور اقبال نے اپنی معرکہ آرا نظم میں غالب کی قدروقیمت کا اعتراف اس طرح کیا ہے کہ ۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے سے جو مستور ہے

محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ زار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

اور منٹو نے نہ صرف یہ کہ غالب کی شخصیت میں انسانی روح کی پیچیدگی اور تضادات کا عکس دیکھا، غالب کو اس واقعے کے باوجود کہ اسے غزل کی شاعری سے کوئی

مناسبت نہ تھی، ان کی شاعری کے وسیع تناظر اوران کی شخصیت کے پھیلاؤ کے باعث ایک آدرش کےطور پرقبول کیا ہے۔

غالب جتنے قدیم اور کلاسیکی ہیں اتنے ہی جدید اور نئے بھی ہیں۔ ان کی تخلیقی کامرانی صرف ہمارے متقدمین کی جنیس (Genuis) کا حوالہ نہیں ہے۔ وہ بیسویں صدی کے جدیداور متنازعہ انسان کی ہستی کے اسراراوراس کی جان سے چمٹے ہوئے سوالوں کو سمجھنے میں بھی ہماری مدد کرتے ہیں۔ وہ اپنی تاریخ، اپنے عہداور اپنے وقت سے آگے نکل آئے ہیں۔ غالب سے ہمارا مکالمہ جدید زندگی اور جدید فکر کی سطحوں پر قائم ہوتا ہے۔ یہاں میں اس مسئلے کے ایک بنیادی پہلو کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔

اصطلاحوں میں سوچنے کا عمل بعض اوقات خطرنات ہوتا ہےاور ہمیں ایسے نتائج کی طرف لے جاتا ہے جو سرے سے غلط ہوتے ہیں۔ ہماری اجتماعی فکر کے واسطے سے ''جدید'' کی اصطلاح نے بھی خاصی غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔ جدید کاری (Modernization)، تجدد پرستی (Modernisor)اور جدیدیت (Modernity) کے مفاہیم صرف ''جدید'' کے لفظ سے متعین نہیں ہوتے اسی طرح ادب میں، فلسفے میں اور سماجیات میں ''جدید'' کا مطلب ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا۔

لیکن دشواری یہ ہے کہ غالب کے واسطے سے ''جدید'' ذہن اور ''جدید فکر'' کا مطلب تقریباً طے شدہ سمجھ لیا گیا ہےاور یہ خیال عام ہے کہ غالب نے اردو کو اپنی روایت سے آزاد ایک نیا ذہن دیا، یا یہ کہ غالب کی فکر اردو کی شعری روایت میں ''نئے پن'' کا پہلا نشان ہے۔ اور اس نئے پن کو بھی گھما پھرا کر ہندوستان کی جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ، جدید سائنس اور ٹکنالوجی اور نئی عقلیت کے دائرے میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔ گویا کہ غالب کو بھی

اٹھارویں صدی کی روشن خیالی، انیسویں صدی کی تعقل پسندی اور معاشرتی اصلاح کے ان تصورات سے جوڑ دیا جاتا ہے جن کا سلسلہ عہد وسطیٰ کے نظام اقدار وافکار کی ابتدائی اور انگریزی کی آمد کے ساتھ ایک نئے نظام اقدار وافکار کی تشکیل وترویج کے ساتھ شروع ہوا۔ اس سلسلے میں کچھ دلیلیں بار بار دی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

1- غالب نے سرسید سے بھی پہلے مغرب کے آئین نو کا قصیدہ پڑھا اور جدید سائنسی ایجادات کا خیر مقدم کیا۔ ثبوت کے طور پر سرسید کی مرتبہ آئین اکبری (ابوالفضل) کے بارے میں غالب کی فارسی تقریظ کافی ہے۔

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویم پار

2- غالب نے اپنے آپ کو ''عندلیب گلشن ناآفریدہ'' کہا ہے یعنی یہ کہ وہ اپنی سرشت کے لحاظ سے مستقبل بیں کے اور اپنی شاعری کے اعتبار سے آنے والے دنوں کے ترجمان تھے۔

3- غالب کے مزاج میں تشکیک (Agnosticism) کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ وہ کسی بھی مسلمہ حقیقت میں یقین نہیں رکھتے تھے۔

4- غالب نے کائنات میں انسان کی حیثیت، انسان اور خدا کے مفروضہ تعلق، مادے کی حقیقت، اشیاء اور مظاہر اور موجودات کی غایت، انسانی ہستی کے مقاصد پر بہت سے سوالیہ نشان قائم کیے ہیں۔ ایک مستقل استفہامیہ انداز غالب کی پہچان ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

5- غالب کے مزاج میں مہم پسندی اور تجسس کا مادہ بہت تھا۔ ایک حالت پر قانع نہیں ہوتے تھے۔ گویا کہ ہمارے شاعروں میں سائنسی ایڈونچر اور سائنسی صداقت کی تلاش کا سودا سب سے پہلے غالب کے یہاں ملتا ہے۔

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

6- غالب ایک نئی انسان دوستی (Humanism) کے نقیب تھے اور مذاہب کی رسمی تقسیم میں یقین نہیں رکھتے تھے۔

رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

7- غالب کا ذہن بہت آزاد اور خود بیں تھا۔ اسے کہنہ پرستی، مردہ پروری اور رسمیت سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ اس ضمن میں وہ اپنے آپ کو فرزند آزاد سے مماثل قرار دیتے تھے۔

ہر کس کی شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

8- اپنی عام زندگی میں بھی غالب جدت پسند Non-Conformist اور ایک حد تک بوہیمین تھے۔ مذہبی شعائر کے پابند نہیں تھے۔ معاشری قوانین اور امتناعات سے ڈرتے نہیں تھے۔

9- مجموعی حسیت اور تخلیقی رویے کی سطح پر غالب کو اپنی عام روایت کی پیروی اور پاسداری کا شوق نہیں تھا۔ زبان کے معاملے میں وہ اجتماعی میلانات سے زیادہ

اپنی انفرادی اور شخصی ترجیحات کے قائل تھے۔

10- غالب طبیعتاً بت شکن تھے، موروثی عقائد کے منکر۔ ان کی مذہبی فکر تہذیبی فکر اور تخلیقی فکر پر ان کے ذاتی رویے ہمیشہ حاوی رہتے تھے۔

11- غالب کو جدید علوم سے براہ راست استفادے کا موقع نہ ملا ہو جب بھی ان کے شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ غالب بعض سائنسی اصولوں کی حقیقت سے آگاہ تھے۔

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

اس طرح کی باتیں غالب کے بارے میں نہ صرف یہ کہ عام طور پر کہی جاتی ہیں، ان کی بنیاد پر غالب کی شخصیت کا ایک تصور بھی قائم کرلیا گیا ہے۔ اس تصور کے مطابق، غالب اردو شاعری کی روایت میں انحراف کے ایک اہم موڑ کی نشاندہی کرتے ہیں اور انھیں بجا طور پر اردو کا پہلا جدید شاعر کہا جاسکتا ہے۔

انیسویں صدی میں خاص کر اس وقت سے جب لارڈ میکالے کے منصوبوں کی روشنی میں ایک نیا تعلیمی خاکہ مرتب کیا گیا اور یہ منصوبے باضابطہ طور پر بروئے کار لائے گئے، ہماری اجتماعی فکر کے محور تیزی سے تبدیل ہونے لگے۔ ایک خاص طرح کا نوآبادیاتی اسلوب زندگی مقبول ہونے لگا۔ سوچنے، حتیٰ کہ محسوس کرنے کی پرانی طرحیں بھی رفتہ رفتہ ترک کی جانے لگیں۔ قاموسیوں (Encyclopeadists) اور مستشرقین کا ایک نیا گروہ سامنے آیا۔ معاشرتی اصلاح اور قومی تعمیر کے ترجمانوں کی اکثریت نے اس گروہ کی برتری تسلیم کرلی۔ ہمارے طرزِ احساس کی قیادت ہماری اپنی روایت اور اپنے ماضی کے بجائے اس گروہ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اس صورت حال کا نتیجہ بالآخر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ یعنی کہ اپنی پسپائی اور کم تری کا اعتراف زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں کیا جانے لگا۔

ہماری ادبی روایت، ہمارا جمالیاتی نظام، ہمارا تخلیقی کلچر، ہمارے علوم، سبھی اس پسپائی کا شکار ہوتے گئے۔ اردو کی علمی اور ادبی تاریخ کے واسطے سے دیکھا جائے تو سرسید سے لے کر محمد حسین آزاد اور حالی تک مغرب سے مرعوبیت کا ایک مستقل رویہ اور اپنی اجتماعی ہزیمت کا ایک مستقل احساس سامنے آتا ہے۔ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار راجہ رام موہن رائے نے اپنی قومی وراثت اور اپنے اجتماعی ماضی کی طرف جو رویہ اختیار کیا تھا اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں ہندوستان کی علاقائی زبانوں کا ادب بھی مغربی روایات اور اسالیب کی چمک دمک میں اپنی زمین سے اکھڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میکالے کا خیال تھا کہ ہندوستان کا تمام علمی ورثہ، انگلستان میں مغربی علوم کی کتابوں کے ایک شیلف کی جتنی قدر و قیمت بھی نہیں رکھتا۔ اصلاح معاشرت کے ہندوستانی ترجمانوں نے یہ فیصلہ نہ صرف یہ کہ قبول کرلیا، اس فیصلے کی روشنی میں اپنی روایت کو مسترد کرنے کا میلان بھی زور پکڑنے لگا۔ چنانچہ نثر و نظم کی روایت کے تسلسل کی طرف سے آنکھیں پھیر لی گئیں اور بیشتر توجہ اس پر مرکوز ہوگئی کہ ایک نئی روایت کیونکر قائم کی جائے۔ شعر و ادب کے کاروباری مقاصد کو فروغ پذیر ہونے کا موقعہ اس پس منظر نے مہیا کیا۔ حقیقت کا وہ تصور جو مشرق سے مخصوص تھا اور جس میں مادی اور مابعدالطبیعاتی عناصر کا ایک ساتھ اختیار کرنے کی صلاحیت تھی، بتدریج معدوم ہوتا ہے۔ اس کی جگہ حقیقت کے ایک ایسے تصور نے لے لی جس کا ظہور مشرقی حسیت کی شکست اور مغربی افکار و اقدار کی کامرانی کے مفروضے سے ہوا تھا۔ سائنسی عقلیت نے حقائق اور مظاہر کی بابت ایک دوٹوک قسم کے سطحی اور محدود نقطۂ نظر کو راہ دی۔ سرسید، آزاد، حالی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، ان سب کی فکر اسی نقطۂ نظر کی تابع دکھائی دیتی ہے اور ہر چند کہ ان سب کے یہاں کشمکش کا ایک احساس بھی

موجود ہے جو انھیں ہمیشہ بے چین رکھتا ہے، مگر یہ اصحاب مغربی فکر اور انگریزی تعلیم کو بہر حال اپنی قومی نجات کا واحد ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔

غالب نے بے شک تبدیلیوں کی اسی فضا میں سانس بھی لی اور مغربی تہذیب کے کمالات سے متاثر بھی ہوئے، لیکن نہ تو انھوں نے حقیقت کی اپنی تعبیر اور تصور پر آنچ آنے دی، نہ ہی اپنی روایت سے الگ کسی اور روایت کے متلاشی ہوئے۔ اس پورے عہد میں تخلیق اور فکری اعتبار سے جو وسعت، لچک اور رواداری ہمیں غالب کی شخصیت میں نظر آتی ہے، کہیں اور نہیں ملتی۔ غالب ہمیں ادب کے اینگلو انڈین تصور، انگریزی تعلیم، مغربی فکر اور ضابطۂ حیات کی طرف سے تقریباً بے نیاز، اپنے آپ میں گم، اپنی روایت سے مربوط دکھائی دیتے ہیں۔

گنجئ یک خط مسطر چہ تو ہم چہ یقین

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

سینہ جویائے زخم کاری ہے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

یہ صرف رواروی میں دیے گئے بیانات نہیں ہیں۔ غالب اس نوع کے مصرعوں اور اشعار کے واسطے سے کہیں اپنی حالت کا اعتراف کرتے ہیں، کہیں گرد و پیش کے حال پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اپنے تمام معاصرین میں، سب سے زیادہ ہوش مند، اپنے زمانے اور اپنی زندگی سے دوسروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ مشروط رہنے کے باوجود، غالب ہمیں سب سے مختلف اور شاید سب سے زیادہ تنہا دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ضمناً ایک واقعے کا ذکر ضروری ہے، یہ کہ غالب اپنے وقت میں اردو یا ہندوستان کے ہی نہیں مغربی زبانوں کے شعرا میں بھی سب سے سربلند تھے۔ فرانس کے انحطاط پرستوں، جرمنی کے اثبات پسندوں اور انگلستان کے رومانویوں میں ہمیں بصیرت کی وہ گہرائی اور فکر کی وہ کشادگی نظر نہیں آتی جو غالب کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انیسویں صدی کی عام فکر اور تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے غالب کے ذہنی سفر، غالب کی طبیعت کے تجسس، ان کے شعور کی سرگرمی اور تحریک کو تو سمجھا جاسکتا ہے لیکن غالب کی شاعری کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ تخلیقی اور فنی بصیرت کا سفر، اجتماعی نصب العین اور سماجی تاریخ کے سفر سے بالعموم مختلف ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری ہمیں مشرق کی تہذیبی جنیئس (Genuis) کے نقطۂ عروج تک لے جاتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے سحر میں گم ہونے، اس سے مغلوب ہونے کے بجائے، اس سحر کو توڑتی ہے۔ اپنی روایت سے منقطع یا منحرف نہیں ہوتی، اس روایت کی توسیع کرتی ہے، اس روایت کو ایک نیا طول دیتی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور بات جس کی طرف توجہ دینا ضروری ہے، یہ ہے کہ غالب

کے زمانے میں عہد وسطیٰ کی تہذیبی اور تخلیقی توانائی نے ان کی شاعری میں درجۂ کمال کو پہنچنے کے باوجود، بتدریج بکھرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ایک بے روح اور سپاٹ نثریت رفتہ رفتہ چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی اور زندگی کے تقریباً تمام شعبے اس کے حصار میں آتے جا رہے تھے۔ غالب نے 1857 سے پہلے ہی شاعری سے جو اپنا ہاتھ تقریباً کھینچ لیا تھا تو شاید اسی لیے کہ وہ اپنے عہد کے بڑھتے ہوئے تخلیقی اضمحلال اور نشاۃ ثانیہ کی تاجرانہ اور کاروباری طاقت میں ترقی کے رمز سے بھی اپنے تمام ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ واقف تھے۔ سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور فکری سطح پر جس قسم کے حالات کا اس وقت غالب کو سامنا تھا، ان میں اپنے داخلی نظم کو برقرار رکھنا آسان نہیں تھا۔ غالب کے بیشتر معاصرین نے ان حالات کے بارے میں سوچنا ہی تقریباً ترک کر دیا۔ غالب کے لیے ان کی مخصوص افتادِ طبع کے پیش نظر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ ہر بڑے شاعر کی طرح غالب کے یہاں بھی نہ تو جذبات آگہی سے الگ تھے نہ آگہی جذبے سے خالی۔ ان حالات میں غالب نے اپنے ہیجانات کی جس طرح تہذیب کی تصادم اور آویزش کی فضا کو جس طرح اپنے لیے قابل قبول بنایا، مذہب، تاریخ، روایت کے سہاروں سے محرومی کو جس طرح اپنے اعصاب اور دماغ پر مسلط ہونے سے باز رکھا، اس سے غالب کے شعور کی طاقت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

اس ایقان کو ہم غالب کا ذاتی منشور بھی کہہ سکتے ہیں اور اسی اندازِ فکر کی سطح پر غالب اپنی گم ہوتی ہوئی اجتماعی تاریخ، ایک بجھتے ہوئے ماضی میں ہمیں موجود بھی دکھائی دیتے ہیں اور اس سے آگے جاتے ہوئے بھی۔ انھوں نے پرانے آزمودہ اور فرسودہ لفظوں

کے نئے مناسبات ڈھونڈ نکالے، پرانے استعاروں کی مدد سے تجربے اور احساس کی نئی صورتیں وضع کرلیں۔ ماضی اور حال میں ایک نیا تخلیقی رابطہ پیدا کرلیا۔ یہ انمل بے جوڑ چیزوں میں ایک نقطۂ اتحاد کی جستجو بھی تھی اور اس جستجو کے ذریعے غالب نے اپنی شخصیت کو تقسیم ہونے سے بھی بچائے رکھا۔

موج خمیازۂ یک نشہ چہ اسلام چہ کفر

یہاں غالب اپنا نقشہ کھینچ رہے ہیں یا اپنے زمانے کا یا وقت کے ازلی اور ابدی تماشے کا؟ شاید ان میں سے ہر سوال کا جواب ایک ساتھ اثبات میں دیا جاسکتا ہے۔ جس طرح دنیا بہ ظاہر ایک دوسرے سے بے ربط، متضاد اور مختلف حقیقتوں سے بھری ہوئی ہے، اسی طرح غالب کی اپنی ہستی بھی نیرنگیوں کا ایک نگار خانہ تھا، ایک کائنات اصغر محدود لیکن مکمل تکمیل ذات کا یہی پہلو غالب کی شخصیت اور شعور پر کوئی حد قائم نہیں ہونے دیتا۔ غالب کی شخصیت اور شعور میں ہمیں ان کے بعد آنے والے وجودی مفکروں کا اندوہ اور جلال ایک نقطے پر مرکوز نظر آتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ سے پہلے کی قدروں، ماقبل نوآبادیاتی (Pre-Colonial) افکار کا ایک سلسلہ غالب ہی کی وساطت سے ہمیں اپنے عہد کی دنیا تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے غالب کی دنیا ہمیں اپنے تمام بڑے شاعروں کی دنیا سے زیادہ مانوس حقیقی اور اپنے حواس واعصاب کی دنیا سے قریب بھی محسوس ہوتی ہے۔

اقبال اور منٹو دونوں کا غالب کو یکساں ذہنی اور جذباتی آمادگی کے ساتھ قبول کرنا اپنی ایک خاص منطق رکھتا ہے اور اس منطق کا ظہور غالب کی انفرادی فکر اور ان کی انوکھی شخصیت دونوں کی تہہ سے ہوا ہے۔

***

ڈاکٹر خالد جاوید

ہمارے عہد میں غالب کی شاعری کی آہٹیں

سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کر دینا چاہیے کہ میرے خیال میں غالب کی شاعری کی ساری قوت ان کی وجودیت میں پنہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب نے باقاعدہ طور پر وجودیت کے فلسفے کو کائی مطالعہ نہیں کیا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عام طور پر ہم وجودیت کے فلسفے کو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے اثرات کو پیدا کردہ سمجھتے ہیں۔ مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔ اپنشدوں اور بدھا کے 'دکھ' کے فلسفے میں ایسے بے شمار رجحان مل جائیں گے جن کا کوئی نہ کوئی سرا وجودیت سے جا ملتا ہے اور جہاں تک مغرب کا سوال ہے تو سارتر اور کامیو یا کارل یاسپرس اور ہائیڈیگ وغیرہ سے بہت پہلے لیر گیگارد (1855 - 1813) کے فلسفے کو پوری طرح فلسفہ وجودیت کہا جا سکتا ہے۔

یہاں وجودیت کے فلسفے پر تفصیلی گفتگو کرنے کی قطعی گنجائش نہیں ہے مگر اتنا ضرور واضح کر دینا چاہیے کہ وجودیت انسان کے جوہر کو صرف ایک تجرید یا تصور سمجھتی ہے۔ اس کا مرکز صرف جیتا جاگتا انسان ہے۔ وجودیت صرف ذات یعنی Being کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہونے Becoming کا مسئلہ ہے۔ اس کی دلچسپی انفرادی وجود میں ہے۔ وجودیت عقلیت، عینیت، میکانیکیت اور جبر کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے کیونکہ

وجودیت کا موقف یہ ہے کہ انسان کا وجود اس کے تصور پر فوقیت رکھتا ہے۔

کامیو نے زندگی اور کائنات میں جاری وساری جیسی لغویت Absurdity کی طرف اشارہ کیا تھا اور جس کا سامنا بقول اس کے اپنے وجود کے عرفان اور اس جبر یا لغویت کے خلاف وجودی بغاوت کے ذریعے ہی کیا جا سکتا تھا۔ میرے خیال میں غالب نے اس سے بہت پہلے ہی اس Absurdity کو سمجھ لیا تھا۔

مگر یہاں مسئلہ عہد کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نیا ہمارا عہد فلسفہ وجودیت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ سوال اپنے عہد کی شناخت کا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم غالب اور اپنے عہد کے حوالے سے کوئی ممکنہ بات کہہ پانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ کیونکہ اب ہم مابعد جدید عہد میں داخل ہو چکے ہیں اور جدیدیت کا زمانہ گزر چکا ہے اس لیے آج کے دور میں وجودیت کے لئے بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ مابعد جدیدیت فرد کو نہیں بلکہ گروہ کو اپنے مطالعے کا مرکز بناتی ہے۔ تثلیثیت مابعد جدید افکار کی اساس ہے۔ انفرادیت کی اب کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ (لیجئے صاحب قصہ ختم۔ غالب بھی پھر تو قصہ پارینہ ہوا ہمارے عہد سے اس کا کیا تعلق؟

مگر ذرا اپنے عہد پر ایک دوسری نظر بھی تو ڈال کر دیکھیں۔ آج کے عہد میں صنعتی نظام (Industrial State) کو ہی اہمیت حاصل ہے۔ سرمایہ دارانہ حکومت ہو یا سوشلسٹ حکومت دونوں کا مقصد بہر حال ایک صنعتی نظام ہی قائم کرنا ہے۔ اس صنعتی نظام میں فرد کا کیا مقام ہوگا؟ فرد تو بہر حال غلام ہی رہے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مارکیٹ اکونومی یعنی کھلے بازار کی معاشیات میں بھی فرد بے چارہ صرف ایک ڈھکوسلا ہے۔ یہاں

فرد صرف ایک بکاؤ شے میں بدل گیا ہے۔ ہمارے عہد نے کال سینٹر کلچر میں وہ نوجوان جو طوطے کی طرح کسی کمپنی کا پیغام صبح سے شام تک رٹتے رہتے ہیں، ان کی فردیت کیا ہے؟ فیشن شو میں Cat work کرتی ہوئی لڑکیوں کے چہرے پر ایسی بھیانک بے حسی کیوں ہے؟ بزنس مینجمینٹ میں کورس کر کے دن بھر دوسروں کے دروازوں پر دستک دے کر انھیں کوئی پریشر کوکر، ایکوا گارڈ یا ویکوم کلینز خریدنے کے لئے گڑگڑاتے ہوئے تھکے ہارے نوجوانوں کے باطن میں ابھرنے والا سناٹا کس نے دیکھا ہے۔ ہمارے ایک فون پر ہوم ڈلیوری سسٹم کے تحت Pizza Hat سے دوڑتے ہوئے ہمارے لئے Pizza کا ڈبہ اٹھائے کم عمر لڑکوں کی پھولتی سانسوں کے درمیان فردیت کی چیخ ہمیں کیوں نہیں سنائی دیتی۔ مارکس وادیوں کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہ جس انفرادیت کے خلاف اب تک آواز اٹھاتے رہے ہیں وہ ایک جھوٹی انفرادیت کا تماشہ ہے جسے False Individuality کہا جاتا ہے۔ صارفیت کے نشے نے اگر انسان کے کسی عنصر کو صدمہ پہنچایا ہے تو وہ سب سے زیادہ اس کا اپنا وجود ہی ہے۔

اس لیے آج اکیسویں صدی میں ایسا کیا ہو گیا ہے کہ 'فرد' کے بارے میں سوچنا گناہ ہے۔ پھر تو واقعی غالب کے بارے میں سوچنا بھی مشکل ہو جائے گا بلکہ شاعری کے ہی بارے میں سوچنا جرم قرار دیا جائے گا۔ غالب تو ہر سچے شاعر کی طرح اپنی ذات سے معنی خیز مکالمے کرتے رہتے تھے۔ ان کی خود کلامیاں اپنی ذات کے عرفان کے بعد شروع ہوئی تھیں۔

ہمارے عہد میں وجود کی معنویت کا مسئلہ بڑھ گیا ہے۔ جنگیں بند نہیں ہوئی ہیں بلکہ ان کی ہولناکیوں کا تماشہ اب ہم بیڈروم میں لیٹ کر ٹی۔ وی۔ اسکرین پر دیکھتے ہیں۔

یہ جنگ سے بھی بھیانک ہے۔ مشہور ماہر نفسیات ایرک فرام کے کہنے کے مطابق جیسے جیسے ہم مہذب ہوتے گئے ہیں ویسے ویسے جنگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا ہے۔ ایرک فرام کے مطابق تہذیب کی ماہیت میں ہی یہ تباہ کن عنصر چھپا ہوا ہے۔ اگر دوسری جنگ عظیم کے بعد ہونے والی مختلف فوجی بغاوتوں اور منظم قسم کی دہشت گردی کو بھی شامل کرلیں تو صورت حال کیا ہوگی۔ فسادات، قتل وخون اور غارت گری اور اس سے بڑھ کر منافقت سے ہماری پوری بیسویں صدی بھری ہوئی ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی یہی سلسلہ چلتا معلوم ہوتا ہے۔ غالب تو انیسویں صدی کا شاعر تھا۔ ہمارے عہد میں آج اگر اس کی معنویت ہے تو اس کی وجہ اس کی شاعری کی وجودی جہت کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے۔ مذہبی روعائیت، دہشت گردی، بے انصافی، تہذیبوں کے نام پر ہونے والا تصادم، اندھا گلوبولائزیشن، انفارمیشن ایکسپوژن اور سیکس کا ایک قابل حرف شے میں بدل جانا، یہ وہ حالات ہیں جن کے دبیز پردوں کے پیچھے انسانیت کی سسکیاں صرف سنائی دیتی ہیں۔ نوبل انعام یافتہ نامور ماہر معاشیات امرتیہ سین نے اپنی کتاب "Identity and Violance" میں انسان کی شناخت اور اس کی صورت حال سے متعلق بہت سے باتیں لکھی ہیں مثلاً آج کے عہد کا انسان تقسیم ہوگیا ہے۔ اس کی شہریت، اس کا مقام، اس کا ذریعۂ معاش، اس کی جغرافیائی پوزیشن، جنس، درجہ، سیاست، پیشے، قومیت، کھانے پینے کی عادتیں، کھیلوں میں دلچسپی، موسیقی میں دلچسپی، سماجی شعور وغیرہ سب مل کر الگ الگ گروہ بن گئے ہیں۔ یقیناً اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امرتیہ سین کے مطابق اب انسان کی کوئی ایک شناخت یا Identity نہیں رہ گئی ہے مگر میرے خیال میں اس مقام پر اس کی فردیت کا مسئلہ اٹھتا ہے۔ شناخت اور فردیت میں بہت فرق ہے۔ فردیت یعنی 'وجود' کو

اس شگاف کے درمیان سے ہی ابھر کر باہر آنا ہوتا ہے۔ غیر معتبر وجود اور معتبر وجود کا فرق بھی اسی مقام سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا سماج کی ساری Rhetoric کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا جائے۔ کیا خود کو بھیڑ چال کا حصہ بنا دیا جائے کہ اس میں بڑی عافیت ہے۔ بڑا اطمینان ہے۔ مگر غالب کہتے ہیں کہ ۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

بہر نوع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے چارہ انسان، ازلی بے چارہ اپنی فردیت کی گم شدگی کا نوحہ پڑھنے کے لیے خود اس کے پاس وقت نہیں کیونکہ بقول سارتر وہ ایک شے یعنی En-soi میں بدل چکا ہے۔ وجودیت کی معنویت کا مسئلہ اس نکتے سے تو شروع ہوتا ہے اور وہیں کے وہیں کھڑے ہیں جہاں بیسویں صدی کے آغاز یا انیسویں صدی کے اواخر میں تھے۔ جمہوری اقدار کے مردہ پنجوں کو ہم اپنی پیٹھ پر چپکے ہوئے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور نام نہاد جمہوری بڑی طاقتیں پاگل ہو جانے کے سوانگ بھرنے میں ہی اپنی طاقت اور گلیمر کا صحیح استعمال سمجھتی ہیں۔ ان حالات میں یہ کتنا گمراہ کن اور خطرناک پیغام ہو سکتا ہے کہ مابعد جدید دور میں نعرہ لگا کر کہا جائے کہ وجودیت ایک قنوطی فلسفہ تھا اس لئے اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر بڑا ادب ہر زمانے میں اپنی خالص ترین ماہیت میں وجودی ہی ہوتا ہے۔ وجودیت تو ایک انسانی صورت حال کا نام ہے۔ یہ کوئی سیاسی سماجی نعرہ نہیں ہے۔ وجود کے کرب سے تو ان Celeberities تک کو گزرنا پڑتا ہے جو Big Brother کے ٹی۔ وی۔ شو کے لیے خود اپنے آپ کو ایک باہر سے تالہ لگا کر بند کیے مکان میں صرف پیسہ کمانے کے لیے ذلت کو برداشت کرتے ہیں۔ (یہ تو بالکل مابعد جدید واقعہ ہی ہے نا)۔

غالب کی تمام شاعری وجود کے کرب کی داستان ہے۔ وجودی تجربہ کوئی قلابازی نہیں ہے جس پر تالیاں بجادی جائیں۔ یہ احساس ہمیشہ اضطراب اور افسردگی کے خول میں بند رہتا ہے۔ یہی اس کے یعنی وجود کے معتبر ہونے کی دلیل ہے۔ یہ افسردہ سی رومانویت نہیں ہے جو آخر کار ستے پن میں بدل جاتی ہے۔ یہ شاہراہ میں تحفظ کے سائے میں چلتے رہنے کے سکھ کو چھوڑ کر ایک خطرناک کہرے سے گھری دلدل بھری پگڈنڈی پر چلتے جانے کی طرح ہے۔ میں ایک بار پھر وہ شعر دہرانے پر مجبور ہوں ۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ غالب کا معاملہ اپنی ذات کے ساتھ تھا۔ ان کا مکالمہ اپنی روح کے ساتھ تھا۔ ان دونوں کے درمیان کبھی کبھی بظاہر نظر آنے والی جھوٹی کائنات ایک بھیانک تماشے کی طرح آکر کھڑی ہوجاتی تھی جسے غالب طرح طرح دھتکارتے رہتے تھے۔ اس کو ان کی شوخی یا ظرافت بھی سمجھ لیا گیا جو غلط فہمی کی بنا پر تھا۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ہر سنگ وخشت ہے صدف گوہر شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

دراصل غالب کی زیادہ تر شاعری ایک قسم کی خود کلامی ہے۔ اس میں ان کی

ذات، ان کا کرب اور ان کا حوصلہ سب کچھ شامل ہے۔ یہ غالب کی خود کلامیاں ہی ہیں جو ان کی شاعری کو وجودی جہت بخشتی ہیں۔ اپنی خود کلامیوں کی روشنی میں ہی غالب اس بیکراں سناٹے تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں جہاں اداسی، دکھ، ناامیدی، گھبراہٹ اور موت کا احساس سب آپس میں مدغم ہوجاتے ہیں۔ غالب کی تنہائی کو اس مقام پر وجودی خدوخال عطا ہوتے ہیں جہاں یہ خود کلامیاں خاموشی میں بدلنے لگتی ہیں۔ اپنے عہد سے نبرد آزما ہونے کی دوسری صورت کسی سچے شاعر کے لئے اور کیا ہوسکتی تھی۔ ژاں ژینے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ سچ اکیلے ہی میں بول پاتے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ ''جیسے ہی میں بولتا ہوں ویسے ہی سب کچھ مایوس کن ہونے لگتا ہے۔ جو انسان مجھے سن رہا ہوتا ہے وہ بھی مجھے مایوس کرتا ہے، صرف اس لیے کہ میں بول رہا ہوں۔ میں الفاظ کے انتخاب سے بھی مایوس ہوتا ہوں۔'' غالب الفاظ کے انتخاب سے کبھی مایوس نہیں ہوئے مگر ایسا صرف اس لیے تھا کہ انھوں نے اپنی روح سے مکالمہ قائم کیا جو بغیر وجودی عرفان کے ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے عہد میں سچ اس طرح بول سکتے تھے کہ اپنی ذات، اپنے وجود کو کس نادیدہ اور مطلق حقیقت کے سامنے اپنے تمام حواس و اعصاب سمیت اور حوصلے کے ساتھ لاسکیں۔ اپنا تماشہ دیکھ سکیں، دوسرے کو دکھا سکیں اور دوسرے کا بھی تماشہ دیکھ سکیں اور یہ کہہ سکیں کہ ؂

درد دِل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں

انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

غالب کی شاعری پر روایتی قسم کی تنقید ہمیشہ سے ناممکن رہی ہے کیونکہ یہ شاعری شعور کی ڈھلان پر پیدا ہوتی ہے۔ منطق کو اس کا تعاقب کرنا ہوتا ہے مگر سوائے اپنی سانس کو پھلانے کے اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ شاعری وہ ممکنہ وجود ہے جو اپنے ہی اندر سے ابھر ابھر کر تشکیل ہو رہا ہے۔

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ، کہ آشفتہ بیانی مانگے

دل وجگر میں پرافشاں جوایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کودم آگے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

بس کی دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب کی اس بے پناہ منفرد اور انوکھی تخلیقی حسیت کو کسی مخصوص عہد سے وابستہ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس زبردست تخلیقیت کو پہلے اپنے عہد سے ہی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس میں جذب ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ تخلیقیت

اپنے عہد کی بندشوں کو توڑ کر اس سے ماورا ہو سکتی ہے۔ ہر عہد کا استعارہ بننے کے لئے اور ہر عہد میں زندہ رہنے کے لیے۔

غالب کی شاعری میں غیر مماثل اشیا کے درمیان مماثلت یا متضاد عناصر کے درمیان ہم آہنگی اور انسان کے ہنسنے اور رونے کی عجیب وغریب دوئی کو گرفت میں لے سکنے کی جو غیر معمولی صلاحیت تھی وہ اسے کسی بھی ایک عہد کی چہار دیواریوں میں قید کر کے نہیں روک سکتی تھی۔ اسے ہر عہد کی شاعری بننا تھا کیونکہ اس کے سروکار مکمل طور پر وجودی تھے۔ وہ سچ جو آدمی کے اپنے ہی اندر سے ظاہر ہوتا ہے اور پھر اسے اس صورت حال سے بہت اوپر بھی اٹھا دیتا ہے، وہی سچ کے ماورا ہونے کا مقام ہے اور یہی ہر عہد میں غالب کے زندہ ہونے کا ثبوت ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

ویسے جہاں تک اس عہد کا سوال ہے جس میں ہم جی رہے ہیں وہ ایک ایسا عہد ہے جس میں یوں تو نہ کسی کو شاعری کی ضرورت ہے اور نہ ہی ادب کی۔ یہ اخلاقی دیوالیے پن کا عہد ہے۔ ہمارے عہد کی ایک بہت بڑی خصوصیت سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی میں چلنے والا کھیل (Game) ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی کے ساتھ، ہر ادارہ کسی نہ کسی کے ساتھ یہاں تک کہ مذہبی ٹھیکے دار بھی ایک دوسرے کے ساتھ مسائل کو سلجھانے یا الجھانے کے لیے ''گیم'' کھیل رہے ہیں۔ بہت کم لوگ اس نازک فرق سے واقف ہوں گے جو

Game اور Play کے درمیان ہوتا ہے۔ Play ایک کائناتی یا کلّی یا Cosmic عمل ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے یہاں Play ہے مگر بندوں کے یہاں Game ہے۔ ایک سچے وجودی کا کام Game کو مٹا کر Play کی سطح تک پہنچنا ہوتا ہے۔ یہ ایک نقصان کا سودا ہے اسے فلسفہ وجودیت ہی خوش دلی کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ انسان کے ضمیر کا اعلانیہ بن کر ہی جینا چاہتا ہے۔ غالب کی شاعری اپنے عہد کی ہی نہیں ہمارے عہد کے ضمیر کا بھی اعلانیہ ہے۔ ضمیر کے پاس نعرے نہیں، بلند آہنگی نہیں۔ اس کے پاس خود کلامیاں ہیں۔ وہی معتبر وجود کی شناخت بلکہ منازل ہیں۔ عہد کے حوالے سے ایک بات کا ذکر کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ ماہر بشریات مارگریٹ میڈ نے ایک گفتگو کے درمیان حال ہی میں کہا تھا کہ ''ہمیں اسکولوں میں تاریخ یا ماضی پڑھانا بند کر دینا چاہیے۔ اس کے بجائے ہمیں مستقبل کی سائنس پڑھانا چاہیے۔ مستقبل کو ہمارے Syllabus کا حصہ ہونا چاہیے تاکہ تخیل زندہ رہے۔ حیرت زندہ رہے۔ انسانی امکان زندہ رہے۔ انسان کا وجود ایک معتبر شناخت کے طور پر تشکیل ہوتا رہے۔

مارگریٹ میڈ کے خیال سے متفق ہوئے بغیر بھی یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ ہر قسم کے مستقبل میں اور ہر قسم کے عہد میں غالب کی شاعری کو مرکزی اہمیت حاصل رہے گی۔ اس کی وجہ غالب کی شاعری کے وجودی خدوخال ہیں کیونکہ اگر انسانی سروکار باقی رہیں گے تو اس طرح کی شاعری بھی باقی رہے گی جو کسی مقصد کا وسیلہ نہیں بلکہ مقصود بالذات ہے ورنہ تو دل بہلانے کو شاعری اور ادب سے زیادہ دلچسپ اور برانگیختہ کرنے والے ذرائع وجود میں آ گئے ہیں جن سے سارے لوگ واقف ہیں مگر وہ بات الگ ہے جیسا کہ غالب نے کہا ؎

ناکامیِ نگاہ ہے برق نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

درخورِ زہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

جب تک انسان قائم ہے اور اسے اپنے ہونے کا تجربہ ہے، اپنے وجود کا شعور اور عرفان ہے، وجودیت کی معنویت برقرار رہے گی۔ اس کا تعلق زندہ انسان سے ہے۔ فرد کی فردیت سے ہے۔ یہ مسائل اس دن ختم ہو سکتے ہیں جب دنیا ایک بار پھر آگ کا گولا بن کر نظام شمسی میں کروڑوں سالوں کے لیے بھٹکنا شروع کرے گی اور انسان کو ایک بار پھر ایک لمبی ہزاروں سال پر بوڑھی بارش کا انتظار کرنا ہوگا۔

انسان کے قائم رہنے اور اس کے ہونے کے تجربے کے ادراک کے نتیجے میں ہی اردو شاعری کے آؤٹ سائڈرِ غالب کی خود کلامیاں وجود میں آتی ہیں جو اپنی Tone کے ذریعے انسانی نظامِ نشانات کی نارسائی کا بھی اظہار کرتی ہیں۔ اس لیے یہ شاعری اپنے عہد کو خود میں جذب کرنے کے باوجود اپنے عہد سے ماورا ہو کر زندہ جاوید بن گئی ہے تاکہ ہر عہد میں اپنے تشنہ امکانات کو بروئے کار لائے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

***

ڈاکٹر ارجمند آرا

بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کا نقیب: غالب ☆

(سماجیاتی نقطۂ نظر سے غالب پر ایک نظر)

'پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟' یہ سوال عہد غالب سے لے کر آج تک غالب کے مداحوں اور نکتہ چینوں کو ذہنی مشق کراتا رہا ہے۔ سوال غالب نے کیا تھا، اس لیے کہ انھیں اپنی وقعت کا بھرپور احساس تھا، اور اب بیٹھے ہوئے --- سوچتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے!!

غالب کی شاعرانہ عظمت اور اس کا منطقی ذہن، اس کا سائنسی طرز فکر اور عقلیت پسندی، اس کی آزاد خیالی اور وسیع المشربی، اس کی سہل گوئی اور جدت پسندی، اس کی مشکل گوئی اور ندرت پسندی ایسے مسلمات ہیں جن کو ہم بالکل ویسے ہی قبول کرتے ہیں جیسے اپنے اردگرد کے ماحول کو، روزمرہ کی زندگی کو، اور اپنے دوستوں اور حریفوں کو۔ غالب کے ساتھ اپنے ابتدائی تعارف کے دور میں اس کی سہل گوئی ہمیں اپیل کرتی ہے لیکن جیسے جیسے ہمارا شعور بالیدہ ہوتا ہے ویسے ویسے غالب کی تہہ داری ہم پر عیاں ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کے وہ اشعار بھی ہم کو بڑی لطیف مسرت سے دوچار کرتے ہیں جن کا مفہوم غالب کی مشکل پسندی کے سبب جگر کو خون کرنے کے بعد ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ کیا عہدِ

حاضر میں غالب کی اس سے زیادہ بھی کوئی معنویت ہو سکتی ہے کہ وہ نامحسوس طریقے سے نہ صرف اردو پڑھنے والوں کے شعور کا حصہ بن گیا ہے بلکہ اس کی افتادِ طبع کا شہرہ گلی گلی، نگر نگر اور دیس دیس میں ہے۔ ہر قسم کے لوگ، اشراف، اہلِ حرفہ، امیر غریب، بوڑھے جوان، عاشق دنیادار، اہلِ سیاست اور دانشور اس کے شیدائی اور سودائی ہیں۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں حدیثِ غالب کی صرف مبتدی ہوں۔ غالب سے میرا تعلق اتنا ہی ہے کہ جب جب اس کو پڑھتی ہوں تو زندگی میں میرے ایقان کی تجدید ہوتی ہے۔ میں یہ مانتی ہوں کہ جب جب زندگی کی عشوہ اندازیوں سے ہم گھبراتے ہیں، جب جب دنیا کا چلن ہمیں مضطرب کرتا ہے تب تب غالب ہمیں پناہ دیتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان تمام تر خوبیوں کا حامل ہو کر بھی فرشتہ نہیں بن سکتا اور تمام خرابیوں کے باوجود شیطان نہیں بن سکتا۔ اس کی انفرادیت اسی میں ہے کہ وہ آدمی ہے اور اپنی کمزوریوں کے باوجود ایک احساسِ فخر، احساسِ ذات کے ساتھ سب سے جداگانہ، سب سے افضل زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنی ذات میں غالب کا بے پناہ اعتماد ہی زندگی میں ہمارے ایقان کی تجدید کرتا ہے۔ غالب کی یہ معنویت میرے نزدیک اہم ترین ہے۔

ہمارے دور کے ایک منفرد نظم گو اختر الایمان نے لکھا ہے کہ غالب اردو غزل کا سیچوریشن پائنٹ ہے۔ یعنی آئندگان میں کوئی بھی وہ کمال حاصل نہیں کر سکتا جو غالب نے کیا اور یہ کہ غالب کے بعد غزل میں نئے امکانات معدوم ہیں۔ رمز و کنایہ جو غزل کا جوہر ہے، غالب کے ہاں اپنے اتمام و کمال کو پہنچا۔ اختر الایمان جو غالب ہی کی طرح ایک انسان دوست اور دانش ور شاعر ہے، بھلا اس کا متحمل کیسے ہو سکتا تھا کہ غزل میں طبع آزمائی کر کے اپنی انفرادیت کو گم کر دے۔ چنانچہ لڑکپن میں چند غزلیں کہنے کے بعد ہی اسے اپنی

بے بضاعتی کا احساس ہو گیا اور بڑی عقل مندی سے ایک اسٹریٹیجک فیصلہ کرکے وہ غزل ترک کرکے نظم کے میدانِ کارزار کا جانباز بن گیا۔ چنانچہ غزل کے میدانِ جنگ میں آج بھی ہے لبِ 'غالب' (ساقی سے معذرت!) پہ مکرر یہ صلا:

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق

غالب کا چیلنج اپنی جگہ، فی الحال ہمارے سامنے چیلنج یہ ہے کہ دیکھیں کہ غالب کی معنویت عہد حاضر میں کس طرح سے برقرار ہے۔

عہدِ غالب — بدلتی ہوئی قدروں کا دور

اس سوال پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غالب مغل حکمرانی کے زوال پذیر دور کا پروردہ ہے، مٹتی ہوئی جاگیرداری تہذیب اور اقدار کا چشم و چراغ ہے۔ وہ اس عبوری دور کا سچا نمائندہ ہے جہاں معاشرے میں نئے تہذیبی تصورات، نئے سائنسی علوم اور نئی اقدار نے اپنے قدم جمانے شروع کردیے تھے۔ انگریزوں کے روز افزوں تسلط کے سبب ایک بالکل ہی الگ قسم کی فضا کی ہمارے معاشرے کے ٹھہرے ہوئے اور بوسیدہ ماحول میں آمیزش شروع ہو گئی تھی۔ غالب کی شخصیت اس دور کی زوال آمادہ قدروں اور نئے علوم و تصورات کے امتزاج کی حقیقی نمائندگی کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں بات بات پر غالب کو اپنا سپاہی زادہ اور سلجوقی ہونا یاد آتا ہے اور کمال احساسِ فخر سے وہ سب کو اس کی یاد دہانی بھی کراتا رہتا ہے، وہیں نئے علوم، نئے تہذیبی تصورات اور ایجادات اس کے توسنِ شوق کو مہمیز کرتی رہتی ہیں، اس کی چشمِ حیرت کو آئینہ کرتی رہتی ہیں، اور مارے جوش کے وہ بھی — چلتا ہے تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ۔ اتنی تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے میں غالب اپنے راہبر کو پہچانتا بھی تو کیسے!

بدلتے ہوئے سماج اوراس کے نظامِ اقدار، اور شکست آمادہ سیاسی بساط کا ایک وہ دور تھا اور ایک آج کا ہمارا دور ہے جس کو نظریات کے فروغ کے اعتبار سے، طرزِ معاشرت، طرزِ معیشت اور طرزِ سیاست کے اعتبار سے جدید ترین اور پیچیدہ ترین دور کہہ سکتے ہیں۔ سائنسی علوم اور ایجادات نے تو اس دور کو جدید بنایا ہی ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خصوصیت گذشتہ صدی میں فروغ پانے والے سیاسی نظریات، حریت، مساوات، اخوت اور انصاف کے نصب العین کی بالادستی اوران آئیڈیلز پر مبنی نئی نئی جمہوریتوں کا قیام ہے جس نے سبھی قوموں کے طبقاتی نظام میں زبردست اتھل پتھل پیدا کی اور معاشرہ اس قدر تیزی سے تغیر پذیر ہوا ہے کہ اگر آج غالب آجائیں تو برجستہ کہہ اٹھیں:

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

سماجیاتی نقطۂ نظر سے غالب کی تفہیم

اس دورِ پُر آشوب میں غالبؔ کی قرأت ایسے متعدد زاویہ ہائے نگاہ سے کی جاسکتی ہے جو فنی اور معنیاتی سطح پر متن کی تعبیر اور تعیینِ قدر کے لیے تنقیدی منظرنامے میں آج رائج ہیں۔ مثلاً ہیتی تنقید میں تشکیلیت پسندی، ردِ تشکیل، ساختیات اور پس ساختیات وغیرہ کے اصولوں کی روشنی میں۔ یا پھر معنیاتی نقطہ نظر سے دیکھیں تو تحلیلِ نفسی، مارکسی طرز فکر، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اصولوں کے تناظر میں۔ یا پھر سماجی معنویت کے ہی ذیل میں تانیثی زاویۂ نگاہ سے بھی متن کو پرکھا جاسکتا ہے۔ پھر ان میں سے بیشتر نظام ہائے نقد کے بھی اپنے اپنے ذیلی دبستان ہیں جن میں سے ہر ایک پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں۔ مجھے چونکہ عہد حاضر میں غالب کی معنویت کو اجاگر کرنے سے سروکار ہے اس لیے اپنے

مطالعے کا رخ میں غالب کی سماجیاتی تفہیم تک محدود رکھوں گی۔

ادبی سماجیات میں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ادب کو سماج کے وسیلے سے اور سماج کو ادب کے وسیلے سے پہچاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بقول محمد حسن ''ادبی سماجیات ،ادب کا مطالعہ سماج کے وسیلۂ اظہار کے طور پر ہی نہیں کرتی بلکہ اس کے آئینے میں عصری مسائل، اقدارِ حیات، بدلتے ہوئے ذوقِ سلیم اور ان کے محرکات کو پرکھنا اور پہنچانا بھی چاہتی ہے۔ اندازِ بیان اور تکنیک کے بدلتے ہوئے تصورات بھی اسی کے دائرے میں آتے ہیں۔'' [1] غزل میں چونکہ فرد کی داخلیت، باطنی کیفیت اور نجی تجربے کا اظہار رمز و اشارے کی زبان میں ہوتا ہے اس لیے فرد کا نجی تجربہ ہوتے ہوئے بھی اندازِ بیاں کی رمزیت اور اس کی تعمیم اسے دوسروں کا افسانہ بنا دیتی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ غالب کی شاعری صرف اپنے ہی عہد کی بدلتی ہوئی قدروں کا افسانہ نہیں کہتی بلکہ دورِ حاضر میں بھی اس کی معنویت برقرار ہے، یا یوں کہیں کہ وہ آج زیادہ برمحل معلوم ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہاں صرف چند تصورات کے حوالے سے بات کروں گی — عاشق و معشوق اور عشق کا بدلتا ہوا تصور، اور معاشرے کی سیاسی و سماجی صورتِ حال۔ یہ بظاہر دو الگ الگ موضوعات ہیں لیکن ان میں قدرِ مشترک وابستگی یا کمٹ منٹ ہے جو عشق کے حوالے سے شخصی اور معاشرے کے حوالے سے اجتماعی قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔

بحیثیت شخصی قدر — عشق اور عاشق و معشوق کا بدلتا ہوا تصور اور غالب

اردو غزل کا روایتی عاشق مکمل سپردگی، نفیِ ذات، جاں نثاری اور وفاداری بشرط استواری کی خوبیوں سے متصف ہوتا ہے تو معشوق پُرکار، پرفریب، ستم پیشہ اور ہرجائی۔ عشق کا روایتی تصور ایک ایسی قدر کا ہے جس میں دنیا سے بیگانگی لازمی شرط ہے۔ غالب

کے یہاں معشوق تو روایتی ہی ہے لیکن عاشق کو عشق کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے صاف دیکھا جا سکتا ہے، اور یہیں سے عشق کا تصور بھی بدلتا ہے۔ غالب کی شاعری سے ایسے بہت سے اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان کو ایک خاص ترتیب میں پڑھا جائے تو عہدِ غالب سے لے کر آج تک عشق کے بدلتے ہوئے رجحانات کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم روایتی تصور عشق کی چند مثالیں دیکھیں:

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہے جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

ظاہر ہے کہ یہ وہ عاشق ہے جو محبوب کا ہر ستم برداشت کرتا ہے لیکن دل کے

ہاتھوں مجبور ہے۔ لیکن بغور دیکھیں تو غالب کا عاشق ایسا روایتی عاشق بھی نہیں ہے جیسا اگلے وقتوں میں ہوتا تھا اور عشق میں اپنی ہستی کو بھول جاتا تھا۔ مثلاً غیر روایتی عاشق کی یہ تصویر یہ ملاحظہ ہو:

میں اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

غالب کا یہ غیر روایتی عاشق عشق میں ناکامی سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ اس کا دلِ وحشی جو عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا ہے، رومؔی کے عاشق کی طرح اپنے دل کی سیکڑوں قاشیں لیے بیٹھا ہے اور راہ سے گزرنے والے خوباں کو ایک ایک قاش پیش کرتا رہتا ہے:

لخت بُرد از دل گزرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروشِ دلِ صد پارہ خویشم

غالب کے اس عاشق کو اپنی زندگی بہت عزیز ہے، اس کے لیے الفتِ ہستی بھی ناگزیر ہے اور عشق بھی۔ یہی اس عاشق کا المیہ ہے کہ وہ عشق اور الفت ہستی کی کشاکش میں فنا ہوا جا رہا ہے۔ غالب کے ہاں عاشق کا یہ تصور نئے زمانے کی آمد کا پتا دے رہا ہے۔ زندگی سے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے اس کی دل چسپیاں عشق کے ایک نئے تصور اور نئے عہد کے نئے شعور کا اعلان کر رہی ہیں:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

غالب کے سو سال بعد اگر فیضؔ کہتے ہیں کہ 'اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا' یا 'تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے'، یا پھر مجروح کہتے ہیں:

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ گل سے پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

تو یہ مضامین نئے عہد کے تقاضوں کے عین مطابق لگتے ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں غالب آنے والی نسلوں کی رہ نمائی کر رہے ہیں۔

جب عشق کا تصور بدلنے لگے، زندگی عزیز محسوس ہونے لگے، اور روزگار کے غم دل فریب معلوم ہونے لگیں تو پھر وہ انسان کیا کرے جس کی تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔ بدلتی ہوئی تہذیبی قدریں منفی بھی ہو سکتی ہیں مثبت بھی۔ عشق کی بدلتی ہوئی قدروں کو پیش کرنے میں بھی غالب نے پیش بینی کی ہے۔ ایک وہ دور تھا جب عاشق کو رقیب کا وجود گوارا نہیں تھا۔ حسد کا جذبہ اس کے ذکر تک سے اسے نالاں رکھتا تھا:

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند برسبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

بلکہ رشک کے مارے معشوق کا نام تک لینا اسے گوارا نہ تھا:

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

لیکن غالب کے غیر روایتی عاشق کو اس پر اعتراض نہیں کہ اس کا معشوق رقیب سے بھی رسم وراہ رکھے۔ اب وہ اس سے ہر سطح پر مفاہمت کو تیار ہے:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
نہیں دیتا پیالہ نہ دے، شراب تو دے

عشق کی بدلتی ہوئی یہ قدریں جن کی پیش بینی غالب نے کی، نئے عہد کے شاعروں کے یہاں حقیقت نگاری بن جاتی ہے۔ مثلاً فیض کا یہ شعر:

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

غالب ہی کے اندازِ فکر کی بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ بدلتی ہوئی وفاداری، عشق کے جذبے کی

ناپائیداری، وقتی اور سطحی محبت کے بیان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں جن سے آج کا عہد عبارت ہے:

اس نے ٹیلیفون کیا ہے اور کسی کے ساتھ ہے
اس کا میرا سمجھوتا ہے کون بڑھائے بات کو

سب سے کیا ہے وصل کا وعدہ الگ الگ
کل رات وہ سبھی پہ بڑا مہربان تھا
(عادل منصوری)

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ شریکِ خواب بنا
(حسن نعیم)

اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا
یہ بات - یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا
(محمد علوی)

یا احمد مشتاق کے یہ چند اشعار:

وہ اپنے گھر میں خوش ہم اپنے گھر میں خوش
یہ تجربہ تھا محبت میں کامیاب رہا

جدائی عشق میں ہے کیوں ضروری
وہ سب باتیں مجھے سمجھا گئے ہیں

اسے کل راستے میں دیکھ کر حیرت ہوئی مجھ کو
یہی لو تھی کبھی جس سے چراغِ عشق جلتا تھا

اردو شاعری کی پوری روایت میں عاشق کو یہی شکایت ہے کہ محبوب جفا پیشہ، ستم گر اور ہرجائی ہے۔ غالب بھی کہتے ہیں:

جو منکرِ وفا ہو، فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے، دشمن کے باب میں

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف!
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

لیکن غالب کے عاشق کے ہاں منطقی استدلال ملتا ہے، وہ غیر جذباتی ہوکر معشوق کی فطرت کا تجزیہ کرسکتا ہے۔ یہ منطقیت اور عقل پرستی غالب کا وصفِ خاص ہے۔ اس کا عاشق تہذیب کے اس نئے عہد اور نئے طرز فکر کا اعلان کر رہا ہے جس کی بنیاد غالب کے دور میں پڑ رہی تھی۔ لیکن جب زمانے کی بدلتی ہوئی قدریں عاشق میں معشوقی کے انداز پیدا کردیں اور غالب ان کی ترجمانی کرے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات عہدِ غالب کی نہیں بلکہ ہمارے عہد کی ہے:

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

غالب کے شاگرد داغ نے بھی کہا:

تو جو ہرجائی ہے تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہ سہی اور سہی، اور نہیں اور سہی

غالب کے عاشق پر سفاکانہ عقل پرستی اس قدر حاوی ہے کہ بلبل کے کاروبارِ عشق پر پھول بھی مسکرا کر کہہ اٹھتے ہیں: کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ یہاں غالب عشق کے اس تصور کی نمائندگی کر رہا ہے جس پر ہماری نئی نسلیں عمل پیرا ہیں اور جو احمد مشتاق جیسے ہمارے عہد کے شاعروں کی حقیقت پسندی میں صاف جلوہ گر ہے:

بھول گئی وہ شکل بھی آخر
یاد کوئی کب تک رہتا ہے

جب روایتیں ٹوٹتی ہیں، قدریں بدلتی ہیں تو تصورِ حیات بھی بدلتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ معاملہ بہرحال زندگی کے ساتھ، انسانی رشتوں کے ساتھ وابستگی کا ہوتا ہے، اور جب وابستگی کے معنی ذاتی مفاد کی حصولیابی تک محدود ہو جائیں تو عشق کے بھی یہی انداز ہوں گے اور زندگی کے دوسرے معاملات کے بھی۔ ایسے میں اگر کوئی شے اپنے ماحول سے کٹی ہوئی لگے، ذہن اس کے ساتھ کوئی ربط، کوئی تطابق پیدا نہ کر سکے تو حیرت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ تضاد دراصل مفاد پرستی کی تہذیب کا زائیدہ ہے۔ ایسے میں معاشرہ بے سمتی اور مایوسی کا شکار نہ ہو تو کیا ہو۔ غالب، جس کے ہاں امید و رجا اس کی زندگی اور شاعری دونوں میں لازمی وصف کی حیثیت رکھتی ہے، جب مایوس ہوتا ہے تو یاس کی اندوہ ناکی اور شدت ناقابل پیمائش ہوتی ہے کیونکہ اس میں یہ مایوسی کی کیفیت خود آگہی اور ادراک کی زائیدہ ہے۔

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ذرا غور کریں کہ جس شاعر کے نزدیک دشتِ امکاں کی حیثیت نقشِ پا سے زیادہ نہیں اور جو عرش سے بھی پرے بلندیوں پر نئے منظر بنانے کی بات کرتا ہے اس کے یہاں اس بلا کی مایوسی دراصل معاشرے کے انھی تضادات کا نتیجہ ہے جو عہد غالب میں زیادہ واضح ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان مفادات اور ان سے پیدا ہونے والے تضادات نے individualism اور exclusivism کی سائیکی کو فروغ دیا۔ جدیدیت کا رجحان جس میں فرد کی تنہائی اور اظہارِ ذات پر زور دیا گیا ہے، دراصل ہمارے معاشرے کی انھی بدلتی ہوئی قدروں کا نمائندہ ہے۔ ہماری شعری روایت میں اس کا اظہار کس طرح ہوا ہے اور یہ کہ غالب کس طرح سے اس نئے رجحان کے پیش رو ہیں، یہ سمجھنے کے لیے اس سیاسی معاشی نظام کو سمجھنا ضروری ہے جو فرد کی سائیکی کی اساس ہے۔

بحیثیت اجتماعی قدر۔ سماجی کمٹ منٹ کا بدلتا ہوا مفہوم اور غالب کی معنویت

انگریزوں کی استعماری حکومت کا قیام، اس کا سرمایہ دارانہ معاشی نظام اور بوقتِ آزادی سرمایہ داری جمہوریت کی بنیادیں ڈال کر جانا وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے ہماری سیاسی تہذیب کی آبیاری ہوئی ہے۔ چنانچہ جس سیاسی ماحول میں ہم آج سانس لے رہے ہیں اس کی خوبیاں، خرابیاں اور جبر وہی ہیں جو انگریزی حکومت کے تھے۔ سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کا خاص وصف یہ ہے کہ اس میں سیاسی اور معاشی نظام دونوں ہی مسابقت کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی بنیادیں انتہاؤں اور تضادوں پر استوار ہوتی ہیں۔ ہر فرقے کا بالائی طبقہ جس کی طاقت روز بروز بڑھتی رہتی ہے، اقتدار میں شریک ہوتا رہتا

ہے۔ معیشت چونکہ ہر ایک معاشرے اور اس کے سیاسی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے اس لیے سرمایہ دارانہ معیشت سیاست کو براہِ راست بازار میں تبدیل کر دیتی ہے۔ آج سیاست میں جو کساد بازاری ہم دیکھ رہے ہیں وہ دراصل اسی طرز حکومت کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ لیکن اس کھیل کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ ایک بار اقتدار کا حصہ بننے کے بعد ان کی باہمی تفریق ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اپنے نظریاتی کمٹ منٹ میں 'لچک' پیدا کر لیتے ہیں۔ جن جمہوری اداروں کے پیچیدہ نظام پر ہمارا معاشرہ چل رہا ہے وہ سب کے سب کسی نہ کسی طور سے اقتدار میں شریک ہیں۔ یہ سرکاری انتظامیہ سے متعلق ادارے اور محکمے ہوں یا قانون، انصاف، مساوات اور حقوقِ انسانی کے لیے قائم کیے جانے والے آزاد ادارے، تعلیمی ادارے ہوں یا فلاحی کاموں کے فروغ کی سرکاری یا غیر سرکاری تنظیمیں جو بنیادی طور پر سرکاری سرپرستی سے ہی چلتی ہیں، یہ سب کاروبار سیاست کا حصہ ہیں اور مقتدر بالائی طبقے میں شامل ہونے کا محض آلہ۔ اس طرح سارے معاشرے کی بساط دو طبقوں میں منقسم نظر آتی ہے — صاحب اقتدار لوگ اور اقتدار سے محروم لوگ۔ ان دو طبقوں کو میں محمود اور ایاز سے تعبیر کروں گی۔ آج ہمارے معاشرے کا منظرنامہ یہ ہے کہ ہر شخص اقتدار کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے کوشاں نظر آتا ہے۔ جو طاقت ور ہیں، ذی حیثیت ہیں وہ اپنے حالات سے مطمئن نہیں اور انھیں مزید طاقت، مزید اختیارات چاہییں۔ ظاہر ہے اس خواہش پر کوئی حد نہیں لگائی جا سکتی اس لیے بالائی طبقہ باہم مسابقت اور کشاکش میں بھی مصروف ہے لیکن محروم طبقات کے خلاف متحد بھی ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی عوام کو شریک اقتدار نہیں کرنا چاہتا۔ یوں ہر فرقے، ہر جماعت کے سارے محمود تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں، یعنی جمہوریت کے حرم پر ان محمودوں کا قبضہ ہے اور غریب ایاز، کُجات، ریزرویشن کے ذریعے کسی صف میں تھوڑی سی جگہ کے پانے کے انتظار میں کھڑا

ہے۔تعلیم کے شعبوں، ادب کے ایوانوں، رضا کار تنظیموں، انسانی حقوق کے اداروں، بلکہ ان تمام اداروں پر جہاں پاور پالیٹکس کے تھوڑے سے بھی امکانات ہیں، انھی محمودوں کا راج قائم ہو چکا ہے۔ ایسے میں ایاز یعنی عام آدمی محرومیوں، مایوسیوں اور ناکامیوں میں گھرا، کربِ ذات اور تنہائی کا شکار ہے، تن تنہا اپنی ذات کے دائرے میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیں تو ہمارے دور کے شاعر کی سائیکی، اس کے منفرد لب و لہجے اور اس کے موضوعات کو جواز دینا مشکل کام نہیں۔ عہد حاضر کے فرد کی سائیکی اور اس کے سروکاروں کا جو اظہار ہماری شاعری میں ملتا ہے یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں، لیکن غالب کے چند اشعار کی مدد سے اور چند واقعات اور حقائق کو مثال کے طور پر پیش کر کے مفاد پرستی، تضادات اور اجتماعی اور انفرادی کرب کی صورتِ حال کی طرف ضرور اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ مثالوں کو صرف مسلمانوں اور ان سے متعلق معاملات تک محدود رکھوں گی کیونکہ عالمی پیمانے پر آج ان کے مسائل سب سے زیادہ موضوعِ بحث اور توجہ کا مرکز ہیں:

2004ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی سربراہی میں این.ڈی.اے. (National Democratic Alliance) حکومت کے دور میں جب Shining India کے اشتہار سے بہت سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ تھیں اور Feel Good کے نعرے نے ان کے دلوں میں سرور کی ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ زمینی حقیقتیں ٹھوکروں میں تھیں، اس وقت بہت سے ادیبوں، فن کاروں اور دانش گاہوں کے اردو اساتذہ نے اپنی امیدوں کی باریابی کے لیے حمایت کمیٹیاں بنا کر اور اشتہارات کے ذریعے اپیلیں جاری کی تھیں کہ لوگ آئندہ انتخابات میں وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی کی حمایت کریں۔ ظاہر ہے یہ ان کی اپنی سیاسی فہم اور وابستگی کا معاملہ ہے اور ہر شخص آزاد ہے جو چاہے موقف اختیار کرے۔[2] یا

پھر ترقی پسند تحریک کے نظریہ ساز، کامریڈ سجاد ظہیر کی صاحبزادی بھی فرقہ پرست قوتوں کے نمائندوں کی حمایتی ہو جائیں [۳]۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً علی سردار جعفری بزعمِ خود بڑے کٹر کمیونسٹ تھے لیکن انھیں اسٹبلشمنٹ کی قربت ہمیشہ راس آئی، چاہے یہ اسٹبلشمنٹ فرقہ واری قوتوں اور سنگھ پریوار پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو جو کمیونسٹوں کو دشمن نمبر ایک سمجھتا ہے۔ گیان پیٹھ ملنے پر انھوں نے کمل کا قصیدہ لکھا اور واجپئی کو بڑا شاعر بھی تسلیم کیا۔ 2004ء کے پارلیامانی انتخابات کے دوران بھاجپائی لیڈر مرلی منوہر جوشی کی حمایت میں الہٰ آباد میں اردو اور ہندی میں ایک پمفلٹ بانٹا گیا جس میں مسلمانوں سے 'مدلل' اپیل کی گئی تھی کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر ڈاکٹر جوشی کو ووٹ دیں۔ الہٰ آباد کے یادگار حسینی انٹر کالج میں 18/اپریل 2004ء کو منعقدہ اردو کے ایک سیمینار میں یہ پمفلٹ تقسیم کیا گیا اور کئی عمائدین قوم اور محبانِ اردو نے بہ نفسِ نفیس اس سیمینار میں شرکت کی۔ جلسے کی نظامت ایک معروف 'ترقی پسند نقاد' اور اردو کے استاذ نے کی تھی۔ [۴] سوال یہ ہے کہ جب جانی مانی ترقی پسند شخصیتیں اور دوسرے روشن خیال لوگ اس قدر کھل کر فرقہ پرستوں کے دوست ہو جائیں تو پھر ان لوگوں پر کیوں حیرت ہو جنھوں نے کسی سماجی سروکار سے اور عوام سے وابستگی کا دعوا بھی نہیں کیا۔ ان عمائدین کی علی الاعلان حمایت کے باوجود احسان فراموش ہندستانی مسلمان اور مشترکہ قدروں میں یقین رکھنے والے ان کے ہندو بھائی؛ بھارتیہ جنتا پارٹی کو مسلم دشمن اور متعصب سیاسی جماعت سمجھتے ہیں تو اس میں کس کا قصور؟ سب جانتے ہیں کہ گجرات کے فسادات کے لیے باجپئی صاحب اور ان کی پارٹی کے کارکنان کس حد تک ذمے دار ہیں۔ ایسے نازک وقت میں جبکہ گجرات میں نسل کشی کا شکار مسلمانوں کے زخم ابھی تازہ تھے (اور آج بھی ہیں کہ فسادات کی ذمے دار نظریاتی

جماعت وہاں ابھی برسراقتدار ہے)، باجپئی کی حمایت کا اعلان کون سی سائیکی اور اخلاقی اقدار کی جانب اشارہ کررہی ہے؟ کیا کہا جاسکتا ہے اقتدار میں شرکت کے جویا یہ محمودانِ ادب وفن، غالب کے اس مشورے کو لبیک کہہ رہے ہیں؟:

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہ رو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

اور ایازِ بے نیاز کی بے بسی کا یہ احوال ہے کہ:

ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

اس کا مایوس وملول دل بزبانِ خاموشی کہہ رہا ہے:

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ رہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

اس طرح کے اشعار غالب کے یہاں بکثرت مل جائیں گے جو ہمارے دور کی بوالعجبی، ابن الوقتی، مفاد پرستی اور مفاہمت پرستی پر منطبق کیے جاسکتے ہیں۔ خیر سے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے والی سچر کمیٹی رپورٹ بھی حکومت کے سامنے پیش کی جاچکی ہے جس کے مطابق ہندستانی مسلمان درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے بھی زیادہ پس ماندہ ہے۔ اس کے باوجود اکثریتی فرقے کے نام پر سیاست کرنے والے سنگھ پریوار کو خوش گمانی ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کی خوشنودی اور خوشامد میں لگی ہوئی ہیں۔ یعنی ذرا تحریف کے ساتھ کہہ سکتے ہیں—— کی جفا ہم سے تو غیر اس کو وفا کہتے ہیں۔ یا:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

بندہ پرور کی بے نیازی حد سے گزرنے کے بعد اب ہمارے وزیرِ اعظم منموہن سنگھ بھی سچر کمیٹی رپورٹ سے لیس ہو کر مسلمانوں کی حمایت میں آگے آئے ہیں اور ان کی پسماندگی کو دور کرنے کے اپنے کمٹ منٹ کا اعادہ کر رہے ہیں۔ اب کانگریس پارٹی سے کون کہے؟:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

لیکن صورتِ حال سے سب واقف ہیں کہ:

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

بین الاقوامی بساط سیاست پر بھی ایاز اسی طرح بے بس دست بستہ کھڑا ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پوری دنیا امریکہ کی یک قطبی قوت کو تسلیم کر چکی ہے۔ کھلے بازار میں جہاں بازار تیسری دنیا کے ممالک کا ہے اور منافعہ امریکی کمپنیوں کا، کسی کو پہلی دنیا کے بازار میں سرمایہ کاری کی اجازت نہیں۔ سرمایہ کسی کے پاس ہے بھی تو نہیں! اور جن کے پاس سرمایہ ہے تیل کی دولت کے روپ میں، ان ممالک کو کسی نہ کسی حیلے سے ٹھکانے لگایا جا رہا ہے۔ امریکہ نے اپنے مفادات کی برآری کے لیے جس طرح تہذیبوں کے

تصادم (Clash of Civilizations) کی تھیوری کو فروغ دیا ہے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جہاد کے پرانے کارڈ کو کھیلنے میں میڈیا اور نئی اطلاعاتی ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا ہے اس سے دنیا کے ایسے بیشتر ممالک کا رویہ مدافعانہ ہو گیا ہے جہاں یا تو اسلامی حکومتیں ہیں یا جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ امریکہ سے شاکی اور اس کی پالیسیوں سے نالاں مملکتوں کا بھی یہ حال ہے گویا:

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

عالمی پیمانے پر دہشت گردی کا موردِ الزام ٹھہرایا گیا مسلمان ایسے میں خدا سے یہی دعا کر سکتا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

غالب کی معنویت — ایک مثال ہجرت کے المیے کی بھی

گذشتہ صدی میں تاریخ کا ایک بڑا المیہ فرقہ وارانہ سیاست، برصغیر کی تقسیم اور فسادات کا پھوٹنا ہے۔ انھی سانحوں سے وابستہ ایک بڑا المیہ مہاجرت کا بھی ہے۔ سرحد کے دونوں جانب سے عوام کا اتنی بڑی تعداد میں ہجرت کرنا برصغیر کی تاریخ میں غالباً پہلا سب سے بڑا واقعہ تھا۔ لیکن بہت سے لوگوں کے لیے یہ ہجرت صرف ایک بار کی ہجرت نہ تھی۔ شمالی ہندستان اور خصوصاً بہار سے مشرقی پاکستان ہجرت کرنے والوں کو ایک اور ہجرت 1971 میں کرنی پڑی جب نسلی اور لسانی تعصب کی بنیادوں پر ایک اور ملک بنگلہ دیش بنا۔ اس تقسیم نے ثابت کر دیا کہ عصبیت چاہے مذہبی ہو یا علاقائی اور لسانی، اس کا انجام عوام ہی

کو بھگتنا ہوتا ہے۔ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ یا تو اپنے گھروں کو خود اجاڑ کر ہجرت کر جائیں یا پھر چیرہ دست اکثریتی فرقے کے عتاب کا نشانہ بنیں۔ لیکن ہجرت اپنے آپ میں مسائل کا حل نہیں۔ جو زخم روح پر لگتے ہیں، اپنی بنیادوں سے جدا ہو کر نئے ماحول، نئے ملک میں فرد کس طرح کے جذباتی، ذاتی اور سماجی تجربات سے گزرتا ہے اس کی نمائندگی غالب کے ان اشعار سے ہوتی ہے، اور غالب کا انفرادی غم ایک آفاقی غم بن جاتا ہے:

کرتے ہو کس منہ سے غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہم دم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ چند حوالے بطورِ نمونہ پیش کیے گئے ہیں جن سے احساس ہوتا ہے غالب کے آفاقی شاعر ہونے کا۔ یہ ایک کوشش بھی ہے یہ دیکھنے کی کہ موجودہ سماجی اور تہذیبی منظر نامے میں ہم غالب کی تفہیم کس طرح سے کریں۔ غالب اپنی موجودگی کا احساس ہمیں روز مرہ کی زندگی میں کراتا ہے، چاہے وہ بدلتی ہوئی اخلاقی قدریں ہوں، تغیر پذیر سماج ہو، سیاسی بساط ہو، تحیر آمیز ایجادات ہوں یا پھر مکمل تصورِ زندگی۔ اسی لیے کچھ الفاظ بھلے ہی کلشے ہو جائیں لیکن غالب کے حوالے سے ہم ان کو بار بار استعمال کرنے کو مجبور ہیں۔ یوں میں آخر میں ہزاروں بار کی دوہرائی ہوئی یہی عبارت پھر سے دوہراؤں گی کہ غالب آفاقی

شاعر بھی ہے اور امکانات کا شاعر بھی۔

☆ یہ مضمون غالب کے 138 ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی، دہلی کے 38 ویں یوم تاسیس پر منعقدہ سیمینار ''غالب اور عہدِ حاضر'' میں مورخہ ۲۴ رفروری ۲۰۰۷ء کو پڑھا گیا۔

ا۔ محمد حسن، ادبی سماجیات، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، دسمبر 1983، ص 9

2. *The Hindu*, New Delhi, 22 March 2004.*Muslim Groups Supprot Bajpai.*

3. *The Pioneer*, New Delhi, 30 April 2004.

۴۔ دینک جاگرن، بنارس رلکھنؤ، 19 اپریل 2004۔ اس کے علاوہ دیکھیں روز نامہ راشٹریہ سہارا (اردو)، مورخہ 11 جون، 23 جون اور 28 جون 2004 کے خطوط کے کالم۔

***

ڈاکٹر شکیل اختر

غالب اور آل انڈیا ریڈیو

ہر دور میں تفہیم غالب کا مسئلہ ہمارے نقادوں اور دانشوروں کو غور و فکر کی دعوت دیتا رہا ہے۔ ہر دور میں غالب کی معنویت کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 20ویں صدی کی ابتدا میں اس جانب کچھ زیادہ ہی توجہ دی گئی۔ ناقدوں نے غالب کے اشعار کی معنویت اور بتوں تک پہنچنے کے لئے مختلف نظریات کا سہارا بھی لیا لیکن میڈیا کی مختلف اشکال جیسے فلم، ڈاکومنٹری، مصوری اور نشریات وغیرہ نے غالب کی تفہیم اور معنویت میں اضافہ کیا۔ ان وسیلوں کے ذریعہ سے غالب کے فکر کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی اور آج بھی کی جارہی ہے لیکن میڈیم میں وسعت کے ساتھ ساتھ غالب کے مفاہیم کی وسعت بھی برقرار ہے اور یہی وجہ ہے کہ غالب آج بھی لوگوں کی جستجو کا اہم مرکز بنا ہوا ہے کیونکہ غالب کا جہاں معنی ابھی بھی انتہائی وسیع ہے بلکہ بیکراں بھی ہے اور یہی بیکرانی آج کے ادیبوں اور نقادوں کے لیے للکارتی رہتی ہے۔ لیکن ان ادیبوں اور ناقدوں سے الگ ہٹ کر غالب کی تفہیم اور ان کی شخصیت کو جاننے کی کوشش میڈیا کے مختلف Format کے ذریعہ بھی ہوئی۔ اس سلسلے میں عبدالرحمٰن چغتائی کی کاوشیں رہ رو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چغتائی نے کلام غالب کے منتخب حصوں کو موضوع بنا کر واٹر کلر سے پینٹنگ کی جس میں مردانہ اور نسائی

پیکروں کے ذریعہ غالب کے اشعار کی تشریح کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اس کے بعد کسی نامور مصور نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ ہاں صادقین نے "مصور غالب نامہ" میں مختلف رنگوں اور خطاطی کے ذریعہ غالب کے اشعار کی تشریح کی۔ اس کے بعد تو غالب کے اشعار جیسے مصوروں کی پینٹنگ کا موضوع بن گئے اور غالب اکیڈمی دہلی کی ایما پر مقبول فدا حسین اور رام چندر سمیت کئی دوسرے مصوروں نے غالب کے اشعار کے مفاہیم کو اپنی پینٹنگ کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی لیکن تفہیم غالب کے سلسلے میں ایک سنگ میل اس وقت آیا جب برجیندر سیال نے پتھروں کے ٹکڑوں کی مدد سے غالب کے مختلف انداز کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ یہ اپنے آپ میں ایک نیا اور انوکھا طریقہ تھا جسے دیکھ کر غالب کے مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے۔ سیال کے تیار کردہ سو مرقعوں کو پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی نے شائع کر کے غالب فہمی اور غالب نوازی کی جانب ایک مستحسن قدم بڑھایا۔ برجیندر سیال کے اس کارنامے کو منظر عام پر لانے میں آج کل اردو کے ایڈیٹر محبوب الرحمٰن فاروقی اور اسٹنٹ ایڈیٹر ابرار رحمانی کی کاوشوں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

آزادی کے بعد غالب کی تفہیم میں ذرا اور شدت آئی۔ ہمارے اسٹیج ڈرامہ نویسوں نے غالب کے فکر و فن پر کئی کامیاب ڈرامے اسٹیج کیے۔ ان ڈراموں میں دود چراغِ محفل (رفیعہ سلطانہ)، پیکرِ غالب (عبداللطیف خاں)، غالب بی (اظہر افسر) غالب کی واپسی (اے۔آر۔ کاردار) سمیت کئی اور ڈرامے اسٹیج کیے گئے۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں فلموں کا بول بالا ہو رہا تھا۔ کئی کامیاب فلمیں بن چکی تھیں۔ اس زمانے کے مشہور پروڈیوسر سہراب مودی نے فلم غالب بنانے کا فیصلہ کیا جس کی اسکرپٹ کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ اسے سعادت حسن منٹو نے لکھا تھا۔ منروا مووی ٹون کے بینر تلے بنی اس فلم نے امید سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اس فلم میں بھارت بھوشن نے غالب کا کردار کچھ

اس طرح نبھایا تھا کہ آج بھی اس کے نقش مٹائے نہیں مٹتے تو دوسری طرف ثریا، درگا کھوٹے اور نگار سلطانہ کے کردار نے اس فلم میں جان ڈل دی۔ یہاں پہلی بار اس بات کی کوشش کی گئی کہ غالب کے حیات اور فکر سے عام لوگوں کو متعارف کرایا جائے۔ تین گھنٹے کی اس فلم میں یہ ممکن تو نہ تھا لیکن پھر بھی یہ ایک کامیاب کوشش تھی۔ فلم غالب 1955 میں ریلیز ہوئی اور اسے اس برس کا بہترین فلم کا ایوارڈ بھی ملا۔ اس کے بعد غالب کی زندگی پر مزید کوئی فلم نہیں بنی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد گلزار نے غالب کی مکمل زندگی کو قسط وار ٹی وی سیریل غالب میں پیش کیا۔ اس سیریل کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ گلزار نے اس میڈیم کے لیے پہلی بار کوشش کی اور نہایت کامیاب رہے۔ اس ٹی وی سیریل کی خوبی یہ تھی کہ غالب کی پوری زندگی اور ان کے عہد کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کو اچھی طرح پیش کیا گیا۔

رقص و موسیقی کے ذریعہ بھی غالب کے اشعار کی تفہیم پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ 1969 میں پہلی بار غالب صدی کے موقعہ پر اوما شرما نے غالب کی کئی غزلوں کی تفہیم پر رقص پیش کیے۔ غالب کی مشہور زمانہ غزل 'آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک' پر جب اوما شرما نے رقص پیش کیا تو کمانی آڈیٹوریم میں بیٹھے ناظرین مبہوت ہو گئے۔

اس کے علاوہ ساز پر غالب کی غزل کو بڑے بڑے گلوکاروں نے گایا ہے اور اسے وہ اپنا افتخار سمجھتے ہیں۔ اب ہم آتے ہیں اپنے موضوع کی طرف کہ غالب کی تفہیم یا مقبولیت میں ریڈیو کا کیا رول رہا ہے۔ ریڈیو نے بھی غالب کے بارے میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ غالب کے مفاہیم کو عوام تک لانے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔ اگر چہ غالب کا انداز کافی پیچیدہ اور ریڈیو کا میڈیم کافی سہل پسند ہے۔ اس لیے بعض اوقات ان

دونوں کے درمیان توازن قائم رکھنا ایک کارِ دارد ثابت ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ادیبوں اور تجزیہ نگاروں نے غالب کو عوام سے روشناس کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ غالب کی فکر کو عام کرنے میں ریڈیو نے اہم رول ادا کیا ہے۔ آج ہندوستانی نشریات کی عمر 80 برس سے زائد ہو چکی ہے۔ اس طویل مدت میں اس نے بہت اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ لیکن اس کے پروگراموں میں اردو زبان و ادب کو ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ ابتدائی دور سے ہی ہمیں پروگراموں کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ ان نقوش کے کئی Shades بھی ہمارے سامنے ابھر کر آئے ہیں جیسے ریڈیو ٹاک، ڈرامہ، فیچر، مباحثہ اور موسیقی وغیرہ۔ ریڈیو کے ان اصناف کے ذریعہ غالب کو اکثر یاد کیا جاتا رہا ہے۔ ان پروگراموں میں غالب کے اشعار کی تفہیم، ان کی زندگی، ان کے دور کے حالات، ان کا سفرِ کلکتہ اور پینشن کے قضیہ کے سلسلے میں پروگرام براڈ کاسٹ ہوتے رہے ہیں۔ ان پروگراموں کی وجہ سے غالب نے بر صغیر کے گلی کوچوں کی سیر کی یا یوں کہیے کہ ریڈیو نے غالب کو ایک محدود ادبی حلقے سے نکال کر عوام الناس کے درمیان کھڑا کر دیا۔ غالب کی مقبولیت کا دائرہ اتنا وسیع نہیں تھا جتنا آج ہے۔ اس مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کرنے کا سہرا ریڈیو کے سر جاتا ہے کیونکہ آج بھی یہی ایک واحد میڈیم ہے جو سکنڈوں میں لاتعداد لوگوں کے دلوں پر دستک دیتی ہے۔ اگر ہم ریڈیو ٹاک کے حوالے سے گفتگو کریں تو غالب سے متعلق پہلا ریڈیو ٹاک براڈ کاسٹ کرنے کا شرف خواجہ حسن نظامی کو حاصل رہا ہے۔ انھوں نے 16/جنوری 1936 کو آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے "غالب کا حلیہ" کے عنوان سے ٹاک نشر کی تھی جس میں نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں غالب کا سراپا نور غالب کی زبانی بیان کیا گیا۔ ایک مختصر اقتباس سنیے۔

"خوب گورا سرخ و سفید جوانی میں تھا
قمری کے محبوب سرو قد سے ملتا جلتا تھا

چہرہ ترکانہ ،پیشانی چوڑی اور بلند،
آنکھیں بڑی بھی اور طرح دار بھی چمکیلی بھی
اور مخمور بھی ،ناک اونچی سیدھی،رخسار
بچپن میں اور جوانی میں دانہ انار، بڑھاپا
آیا تو سفید اور زارو نزار سینہ چوڑا
جس کے پہلو میں درد سے بھر پور دل بڑا
بھی اور سوزو گداز سے لبریز بھی"

بحوالہ کاناباتی صفحہ 47

غالب کے حوالے سے تادم تحریر یہ پہلی تقریر کافی مقبول ہوئی۔ دور دراز کے لوگوں نے پہلی بار غالب کے حلیہ کے بارے میں سنا تو دوسری طرف خواجہ حسن نظامی کی تحریر کی شگفتگی اور انداز پیش کش نے اچھوتے نقوش مرتب کئے۔اس کے بعد گاہے گاہے آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے غالب کی شاعری اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جانے لگا۔ایک ایسی ہی کوشش 16رفروری 1944 کو آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے نشریے میں کی گئی جس کا موضوع تھا" غالب کا فلسفہ زندگی" اور ٹاکر تھے ڈاکٹر عبدالحق۔ دراصل یہ ایک میگزین پروگرام کی صورت میں تھا جس میں مذکورہ ٹاک کے علاوہ "شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے" کے عنوان سے ایک مباحثہ بھی نشر کیا گیا جس کے شرکا تھے شاہد احمد دہلوی اور سید وقار عظیم اور پروگرام کے آخر میں نوائے غالب کے تحت غالب کے منتخب کلام کو سحاب قزلباش اور شکیل بدایونی نے پیش کیا۔اس طرح بیک وقت ٹاک، مباحثہ اور غزلوں کی پیش کش سے سامعین میں غالب سے متعلق معلومات میں اضافہ اور یوں

غالب ریڈیو کے وسیلے سے عمومی لوگوں تک پہنچ گئے۔اسی زمانے میں ریڈیو لکھنؤ کی اردو نشریات بامِ عروج پر تھی جہاں انصار ناصری، وشوامتر عادل،شوکت تھانوی جیسے پروگرام پروڈیوسر موجود تھے۔فروری 1956 میں اردو کے ابھرتے ناقد آل احمد سرور نے ریڈیو، لکھنؤ سے ایک ٹاک پڑھی ،موضوع تھا''غالب :شخصیت کے آئینے میں''۔اس ٹاک کو رسالہ آواز نے اسی ماہ کے شمارے میں اہتمام سے شائع کیا۔ایک اقتباس سنئے۔

"غالب کے مزاج میں ایک نرگسیت تھی ۔انھوں نے عشق بھی کیا ہے مگر دراصل اپنے آپ وہ عاشق تھے۔یہ ان کی بڑائی کی دلیل ہے کہ ان کی نرگسیت کم ہوکر ایک انانیت رہ گئی اور یہ انانیت ایک نظر میں تہذیبی قدر بن گئی۔غالب کے تخیل نے زندگی کے ہر حسن کوفن کا ایک استعارہ بنالیا اور استعارہ کے نقاب میں شوخی کی کرنیں پیدا کیں۔غالب کی شخصیت کی سب سے نمایاں وصف،اس طرح ان کی شوخی بن جاتی ہے جو کبھی حسن تخیل بن کر،کبھی ادائے رندانہ بن کر اور کبھی ایک عارف کے تبسم زیرلب میں اور کبھی ایک زندگی کی سپاہی کی طنز کی تلوار میں،رونما ہوتی ہے۔''

(بحوالہ آواز 22رفروری 1956)

آپ نے دیکھایا سنا کہ کس طرح آل احمد سرور نے سامعین کو غالب کی شخصیت کے ایک مخصوص پہلو سے واقف کرایا۔20رمئی 1956 کو جالندھر سے رات آٹھ بجے کنہیالعل کپور نے ''فن خطوط نویسی اور غالب'' کے عنوان سے ایک ٹاک براڈ کاسٹ کی جس میں سامعین کے ساتھ خطوط نگاری کے اصول اور غالب کے خطوط کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی۔

آل انڈیا ریڈیو نے 15/ فروری 1956 کو یوم غالب منانے کا اعلان کیا تھا جس کے تحت آل انڈیا ریڈیو، دہلی، لکھنو، جے پور، پٹنہ، جالندھر اور بمبئی سے غالب سے متعلق خصوصی پروگرام نشر کیے گئے۔

22/فروری 1957 کو آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے وقار احمد رضوی نے ''غالب بحیثیت صاحب طرز نثر نگار'' کے موضوع پر ٹاک پڑھی اور غالب کے خطوط کے حوالے سے ان کی نثری صلاحتوں کا جائزہ لیا۔ایک اقتباس دیکھیں۔

"غالب کا مطالعہ محض اس لیے دلچسپ نہیں کہ انھوں نے لگواز و آبداد شعر اور شگفتہ و شیرین نثر لکھی بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ہمارے ادب میں جدید وقدیم کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ نئی نسل کو محبوب ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اگر غالب کے اردو خطوط بھی رفعات بیدل اور انشائے مادھورام کے طرز پر لکھے جاتے اور اردو میں دریائے لطافت کی جو مقفیٰ و مسجع عبارت رائج تھی۔اس کی بدولت شاید آج تک اردو نثر غالب کی سادگی اور پرکاری کی لذت و شیرینی سے نا آشنا رہتی"

(بحوالہ آواز فروری 1957)

اور یوں سلسلہ دراز ہوتا گیا اور غالب پر ہر دور کے مستند لکھنے والوں کو ریڈیو نے دعوت دی۔خواجہ غلام الدین نے 22/فروری 1960 کو غالب ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے ٹاک پڑھی۔ پندرہ منٹ کی اس نشریہ میں انھوں نے غالب کی عظمت ان کے اشعار اور ان کی زندگی کے واقعات میں ڈھونڈھنے کی کامیاب کوشش کی۔1964 میں آل انڈیا ریڈیو کی اردو مجلس سے ادب سے متعلق معیاری پروگرام پیش کیے گئے۔ساغر نظامی، جی ایم

شاہ، اور رفعت سروش نے اپنی محنتوں سے اردو نشریات کو بام فلک پر پہنچا دیا تھا۔ اکتوبر 1964 میں رفعت سروش نے تقریروں کا ایک سلسلہ ''نفسیاتی زاویئے'' شروع کیا جس میں اہم شعراء کے اشعار کی وساطت سے ان کی کیفیات اور نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر اہم دانشوروں نے تقریریں کی۔ اس سلسلے کی پہلی تقریر میر تقی میر پر تھی اور مصرعہ تھا۔

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ظاہر ہے اس احساس برتری کے پس پردہ کہیں میر کی احساسِ کمتری تو نہیں ہے۔ اس تقریر کو لکھا تھا نفسیات کے پروفیسر اور ماہر تعلیم مرزا باقر مہدی نے۔ اس سلسلے کی دوسری تقریر مرزا اسداللہ غالب کی ذہنی کشمکش اور گوں ناگوں کیفیات کی عکاسی پر مبنی تھی جس کا موضوع تھا۔

'کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے'

اس موضوع پر پروفیسر خورشید الاسلام نے بہت عمدہ تقریر لکھی اور پڑھی بھی۔ جس میں اس مصرعے کے حوالے سے غالب کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کا کھل کر اظہار کیا جس سے غالب کی تفہیم عمومی سطح پر سامعین میں ہوئی۔ اس طرح ریڈیو نے روز بروز غالب کے مداحوں اور چاہنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔

ریڈیو کے ذریعہ غالب کی تفہیم کی سعی میں اس وقت زبردست کامیابی ملی جب اردو سروس کا قیام عمل میں آیا۔ اس سروس نے غالب سے متعلق تقریروں، فیچروں، ڈراموں اور مباحثوں کا سلسلہ شروع کیا جس میں اردو ادب کی سرکردہ شخصیات نے حصہ لیا۔ اردو سروس کا ایک معروف سلسلہ کارواں در کارواں تھا جس میں مختلف ادبی کتابوں اور معلومات پر سلسلہ وار تقریریں نشر کی جاتی تھیں۔ اسی سلسلے کے تحت ''غالب کے خطوط'' کے موضوع پر

پروفیسر شمیم حنفی نے تقریر پیش کی۔ دس منٹ کی اس تقریر میں انھوں نے نہایت سلیس اور شستہ زبان میں اور میڈیم کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب کے خطوط اور اس کے پس منظر یا اس دور کے ردعمل کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"خطوط نگاری کا جو سلسلہ غالب کے زمانے میں رائج تھا غالب نے اس سے ہٹ کر ایک الگ راستہ نکالا۔ حالی نے خطوط کے واسطے سے غالب کی انفرادیت کا تعین تین بنیادوں پر کیا ہے ایک تو یہ کہ غالب لوازم نامہ نگاری سے انکار کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے ادائے مطلب کے لیے ایک مکالماتی پیرایہ اختیار کیا اور تیسرے یہ کے ہر خط میں غالب کوئی ایسی بات لکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے مکتوب الیہ خوش اور محظوظ ہو۔"

اس مختصر سے اقتباس سے غالب کے اس ذہنی رویے کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور سے ہر سطح پر بغاوت کرتے ہیں۔ جب ثقیل نثر لکھی جا رہی تھی تو انھوں نے اس سے انحراف کر کے ایک نئی راہ نکالی۔ شاعری مشکل کی جا رہی تھی تو اس میدان میں وسعت بیان کا راگ چھیڑ کر آسان زبان میں شاعری شروع کی۔

1998 میں جب پورے ملک میں غالب کی پیدائش کا 200 سالہ جشن منایا جا رہا تھا تو ریڈیو بھی اس جشن میں دوش بدوش رہا اور اردو سروس سے 'غالب بصد انداز' کے عنوان سے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا جو لگ بھگ ایک سال تک چلتا رہا۔ اس سلسلۂ تقریر کی خوبی یہ تھی کہ اس میں غالب کے کسی ایک مصرعے کے حوالے سے غالب کے دور، ان کی شاعری اور ان کے ہم عصر شعراء سے متعلق جامعیت کے ساتھ بات چیت نشر کی جس نے سامعین کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے۔ طوالت سے گریز کرتے

ہوئے اس کے موضوعات اور مقرر کے نام سن لیجیے اندازہ ہو جائے گا۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر	پروفیسر محمد ذاکر
اپنی ہستی ہی سے ہوں جو کچھ ہوں	پروفیسر شمیم حنفی
برف سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم	پروفیسر عتیق اللہ
نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا	پروفیسر محمد حسن
ڈوبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا	پروفیسر محمد حسن
دیکھنا تقریر کی لذت جو اس نے کہا	مظہر امام
رو میں ہے رخش عمر	پروفیسر ابوالکلام قاسمی
ہیں اہل خرد کس روش ناز بہ نازان	پروفیسر اسلم پرویز
سنبھلنے دے مجھے اے ناامید کیا قیامت ہے	پروفیسر عبدالحق
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں	نثار احمد فاروقی

تقریباً ایک برس تک یہ سلسلہ پوری کامیابی کے ساتھ چلتا رہا اور سننے والوں نے اس سیریز کو کافی پسند کیا اور بہت سارے توصیفی خطوط بھی آئے۔

ریڈیو ٹاک سے قطع نظر ریڈیو فیچر کے ذریعہ بھی غالب کی شاعری اور ان کی زندگی کے حقائق کو پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ ابتدا سے ہی اس طرح کی فیچروں کا ذکر ملتا ہے۔ دراصل فیچر ریڈیو کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی بھی حقائق کو Graphic کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور اس گرافک کا تانا بانا الفاظ کے ذریعہ بنا جاتا ہے تاکہ پوری بات واضح انداز میں بیان کی جاسکے۔ اس طرح کی کوششیں آل انڈیا ریڈیو کے تمام اہم مراکز سے کی گئیں جیسے 16/ فروری 1945 کو ریڈیو لکھنو نے ایک

فیچر براڈ کاسٹ کیا تھا جس میں غالب کی زندگی کو ان کے کلام کی روشنی میں پیش کیا گیا۔

آل انڈیا ریڈیو، لاہور نے 16/فروری 1944 کی رات 10 بجکر 5 منٹ پر آفتاب احمد خاں کا لکھا ہوا فیچر ''میں ہوں اپنی شکست کی آواز'' براڈ کاسٹ کیا۔ اس فیچر پروگرام پر پیشگی تبصرہ کرتے ہوئے رسالہ آواز کے مدیر نے فیچر کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

''شعر آئینہ ہے انسان کی زندگی کا اور جہاں انسانی احساس کی آواز خود بخود شعر کے سانچے میں ڈھل گئی پر اثر بن گئی۔ مرزا غالب کے اشعار بھی ان کے ماحول کی بولتی تصویریں ہیں۔ دوستوں کی بے وفائی، دنیا کی بے قدری، زندگی کی تلخی ایک زہر آلود نشتر بن کر ان کے دل میں اتر گئی۔ ان کو اپنی بے بسی اور زمانے کی ناموافقیت کا بہت گہرا احساس تھا۔ یہ اس کا اثر ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ابدی درد کا اظہار کر کے قنوطیت کے درجہ تک اپنی راہ ڈھونڈھتی نظر آتی ہے۔''

ان باتوں پر یہ پورا فیچر مبنی تھا جسے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ لائیو پیش کیا گیا۔ 1957 میں آل انڈیا ریڈیو نے کل ہند پیمانے پر پہلی جنگ آزادی 1857 کا جشن منانے کا فیصلہ کیا اس لیے مختلف اسٹیشنوں سے مختلف نوع کے پروگرام براڈ کاسٹ کیے گئے۔ آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے کثیر تعداد میں مختلف موضوعات پر فیچر نشر کیے گئے۔ اس زمانے میں مرزا محمود بیگ ریڈیو کے اچھے لکھنے والوں میں تھے۔ اس صد سالہ تقریب کے لیے انھوں نے لگ بھگ 13 فیچر لکھے جس کا محور دلی ہی تھا۔ ان فیچروں میں ایک فیچر ''مرزا غالب'' تھا جو 22/اگست 1957 کو دہلی اسٹیشن سے نشر ہوا۔ نصف گھنٹے کے اس فیچر میں جناب مرزا محمود بیگ نے مرزا غالب، ضیاء الدین، حکیم احسن اللہ خاں، حکیم آغا جان

عیش، راقم الدولہ، ظہیر الدین و ضیا الدین، نیر درخشاں اور ایک راوی کے کردار کی مدد سے غالب کے دور کی ادبی اور سیاسی زندگی کا نقشہ نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا تھا۔ ایک جگہ غالب انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اقتباس

''غالب :حکیم صاحب، آج کل دل پر عجیب کیفیت طاری ہے۔ شوخ میں بھی ہوں، یا یوں کہیے تھا۔ عیش صاحب سے بھی دو قدم آگے۔ مگر اس ہنگامے نے اور انقلاب زمانہ نے دل میں جو درد پیدا کیا وہ چند شعروں میں جھلک آیا ہے وہی پیش کیے دیتا ہوں۔

سب ! ارشاد ارشاد

غالب ! بھئی خود نہیں سناؤں گا۔ یہ میاں ظہیر یا میاں ضیاء الدین سنائیں گے۔ تو میاں ظہیر تم ہی سناؤ۔۔۔۔''

اس کے علاوہ اردو سروس سے فیچر پروگرام آئینہ کے تحت پروفیسر عتیق اللہ کا ایک فیچر ''غالب کا ہے انداز بیاں اور'' میں بھی غالب اور دور غالب کو سمجھنے کی اچھی سعی کی گئی ہے جس میں مریم کاظمی اور ایس ایم شفیق کی آوازوں نے اس فیچر کو اور دلکش اور مسحور کن بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ عبید الرحمٰن ہاشمی کا تحریر کردہ غالب نمبر اور شارب ردولوی کا تحریر کردہ غالب نمبر بالترتیب فروری 1981 اور نومبر 1982 میں براڈ کاسٹ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ پروفیسر شمیم حنفی کا تحریر کردہ فیچر غالب نیشنل پروگرام آف فیچر میں براڈ کاسٹ ہوا جس نے سامعین کے درمیان کافی مقبولیت حاصل کی اور اسے دوسری علاقائی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔

اس طرح ریڈیو کی اس صنف نے بھی غالب فہمی کو آگے بڑھانے، غالب کی

شناخت کو عمومی سطح تک پہنچانے اور مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ضرورت آج اس بات کی ہے کہ اس کی گمشدہ کڑیوں کو بھی تلاش کیا جائے تا کہ غالب فہمی اور غالب کی مقبولیت میں ریڈیو کا کردار کیا ہے کھل کر سامنے آسکے۔

مذاکرے یا مباحثے بھی ریڈیو سے اکثر نشر ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے مذاکروں میں ادبی موضوعات کا بھی احاطہ کیا جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی بھی بڑے یا اہم شاعر کے ذہنی رویے یا اس کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے لیکن دورانیہ کم ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی بات ممکن نہیں ہو پاتی۔ ابتدائی دور کے مذاکروں کا سر دست کوئی ریکارڈ تو دستیاب نہ ہو سکا لیکن چند ادبی مذاکرات جو غالب پر نشر کئے گئے ان کے ٹیپ لائبریری میں موجود ہیں۔ تاہم آج تک کسی بھی ادبی مذاکرے کا کوئی مجموعہ بھی منظر عام پر نہیں آیا۔ اردو سروس کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو پروگرام ادبی نشست کے تحت عہد غالب کا شعری ماحول 4/اگست 2005 کو نشر کیا گیا جس کے شرکاء تھے ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر نعمان خاں اور ڈاکٹر ابرار رحمانی۔ غالب کے کلام کی معنویت عہد جدید میں اس موضوع کے تحت اردو سروس سے ایک مذاکرہ 19/دسمبر 2002 کی رات دس بجے نشر کیا گیا جس میں پروفیسر اسلم پرویز، قاضی افضال حسین اور شمس الحق عثمانی نے حصہ لیا اور موجودہ دور میں غالب کے کلام کی معنویت کہاں تک ہے اس پر کھل کر بحث کی گئی۔ جبکہ 20/فروری 2003 کو تفہیم غالب کے وسائل اور مسائل کے عنوان سے ادبی نشست کے تحت مذاکرہ براڈ کاسٹ کیا گیا جس میں ڈاکٹر خورشید احمد، ڈاکٹر جمیل اختر اور ڈاکٹر آفتاب احمد نے حصہ لیا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کسی بھی نشریاتی ادارے کے پروگراموں کا زیادہ تر حصہ موسیقی کے پروگراموں پر مبنی ہوتا ہے اور ایک اندازے کے مطابق 60 فیصد سے زائد پروگرام موسیقی کے ہی ہوتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے بھی بیشتر

پروگرام موسیقی پر مبنی ہوتے ہیں جو عوام کی تفریحی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ ریڈیو نے غالب کی غزلوں کو بھی ساز پر Compose کرا کے نشر کیا ہے جسے لوگوں نے کافی پسند کیا۔

الغرض ریڈیو نے غالب کی تفہیم اور مقبولیت میں مختلف طریقے سے اہم رول ادا کیا ہے۔ آج پورے ہندوستان میں غالب کو جس طرح کی مقبولیت حاصل ہے اور جس طرح ایک عام آدمی یا غیر اردو داں غالب سے متعلق جانکاری رکھتا ہے وہ ریڈیو کی ہی دین ہے اس نابینا صنف ترسیل کی ان خدمات سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

***

خواجہ حسن نظامی

میرزا غالب کا روزنامچہ

غدر کی نسبت غالب کی تصنیف :

میں نے آغاز یازدہم مئی 1858 سے یکم جولائی 1858 تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی 15 مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور اس کا التزام کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے جو نظم اس نثر میں درج ہے۔ وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔

نوٹ : یہ کتاب دستنبو کا ذکر ہے۔ آگے بھی جگہ جگہ اس کی کیفیت مذکور ہوئی ہے اور غالباً اسی کتاب کو دیکھنے کے بعد انگریزی حکام اعلیٰ کو غالب کی قدر ہوئی اور شروع کی بیزاری، نفرت، حقارت اور شبہ جاتا رہا جس کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ کیونکہ دستنبو دیکھنے سے پہلے گورنر اور دیگر حکام انگریزی غالب کو معمولی شاعر اور بھاٹ خیال کرتے ہوں گے اور بہادر شاہ کا سکہ کہنے کے سبب اور قلعہ میں جانے آنے کی وجہ سے ان پر پورا شبہ باغیانِ غدر سے میل جول کا ہوگا۔ مگر جب کتاب دستنبو پڑھی گئی ہوگی اور اس سے غالب کی قابلیت اور غدر سے بے

تعلق ظاہر ہوئی ہوگی تب گورنر اور حکام انگریزی نے پینشن جاری کی ہوگی۔

حسن نظامی

غالب چشتی نظامی تھے شیعہ نہ تھے:

میاں نصیرالدین اولاد میں سے ہیں۔ شاہ محمد اعظم صاحب کے وہ خلیفہ تھے مولوی فخرالدین صاحب کے۔ اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔

نوٹ : غالب کی نسبت شہرت ہے کہ وہ اثنا عشری شیعہ تھے اور مکتوبات میں انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں مگر یہاں وہ لکھتے ہیں کہ میں مولوی فخرالدین صاحب کے خاندان کا مرید ہوں۔ جو چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے۔ درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحبؒ میں ان کا مزار ہے اور وہ فرزند تھے حضرت مولانا نظام الدینؒ اورنگ آبادی کے اور غالب کے اکثر احباب اور لہارو کا خاندان بھی حضرت مولانا فخر صاحبؒ مذکور کے سلسلہ میں مرید تھا۔ میاں کالے صاحب ان ہی مولانا فخر صاحب کے پوتے تھے جو بہادر شاہ کے پیر سمجھے جاتے تھے اور اسی وجہ سے ان کی املاک و جائداد کی ضبطی ہوئی جیسا کہ غالب نے اسی روزنامچہ میں لکھا ہے۔

پس اگر غالب چشتی نظامی سلسلہ میں مرید تھے تو شیعہ کیونکر ہو سکتے تھے کیونکہ شیعہ مرید نہیں ہوا کرتے۔ مگر انہوں نے خود لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں اس مشکل کا حل یہ ہے کہ چشتی نظامی فقرا اور ان کے مریدین محبت اہل بیت میں بہت غلو رکھتے ہیں۔ اور بارہ اماموں سے بھی تعلق خاص رکھتے ہیں اس بنا پر غالب نے اپنے آپ کو اثنا عشری یعنی بارہ ائمہ کا ماننے والا لکھا اور نہ وہ شیعہ نہ تھے شیعہ ہوتے تو مرنے کے بعد علی گنج شاہ مردان کے قبرستان میں دفن ہوتے

جو صفدر جنگ کے قریب ہے اور جہاں اس وقت کے تمام شیعہ امرا دفن ہوا کرتے تھے۔ اور اب بھی ہوتے ہیں۔ سنیوں خصوصاً چشتیوں نظامیوں کے قبرستان میں دفن ہونا اور درگاہ حضرت سلطان جی صاحب میں جو تفضیلیہ سلسلہ کے بانی ہیں ان کی میت کا لایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ سنی تھے شیعہ نہ تھے۔ ان کی قبر بھی سنی طریقہ کی بنائی گئی ہے یعنی اس پر اونچا اونٹ کے کوہان کی صورت کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے۔ شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں۔ ابھرا ہوا یا اونٹ کے کوہان کی شکل کو تعویذ ان کے ہاں نہیں بنایا جاتا۔

غالب کی قبر پر تاریخ میر مجروح کی کہی ہوئی کندہ ہے جو غالب کے شاگرد اور شیعہ مذہب رکھتے تھے وہ تاریخ یہ ہے۔

کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محزوں
تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک

۱۲۸۵ھ حسن نظامی

قلعہ کی تباہی کی پیشین گوئی:

مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔

نوٹ : یہ تحریر غدر سے پہلے کی ہے۔ لال قعہ اور اس کے باشندوں کی نسبت جس انداز سے لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادوں کے اطوار اور ملک کی سیاست

کے رخ کو دیکھ کر غالب نے سمجھ لیا تھا کہ اب یہ رونق چند روز کی مہمان ہے گو غدر کی خبر غالب کو نہ تھی کہ غیب کا علم نہ جانتے تھے پھر بھی آثار و قرائن سے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ انگریز اب اس بادشاہی کھلونہ کو سامنے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ جب ہی تو انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ ''یہ صحبت چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں؟'' اور یہ لکھ کر تو انہوں نے پیشن گوئی کا کمال ظاہر کر دیا کہ ''کیا معلوم اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو''۔ گویا غالب کو قلعہ کی تباہی کا اتنا یقین تھا کہ ایک دو سال کی قید بھی انہوں نے لگا دی۔

حسن نظامی

اب دہلی میں کون رہتا ہے؟:

کہتے ہیں دلّی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ مگر اب یہ وہ دلّی نہیں ہے بلکہ ایک کمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود ومعزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں اناث میں سے جو پیرزن ہیں۔ وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خان بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے کا پینشن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ دار بنکر نامراد بن گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آ گیا ہے اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں مکان اگر چہ رہنے کو مل گیا ہے۔ مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدین کی پانسو روپے کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ

خراب پھر لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپیہ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال ہے وہ بیان واقع ہے۔

نوٹ : جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اب دہلی میں نہ صاحب اخلاق و مروت ہیں، نہ علم و ہنر والے ہیں، نہ امرا ہیں، نہ شعرا ہیں۔ نہ پہلے سے علما و فقراء نظر آتے ہیں۔ ان کو غالب کی یہ تحریر پڑھنی چاہیے کہ غدر نے اب سب کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایسا تباہ کیا کہ آج تک اس شہر میں وہ پہلے سی بات پیدا نہ ہو سکی۔ اب دہلی میں دہلی والے کہاں ہیں؟ پردیسی لوگ آباد ہیں۔ دہلی والے یا تو پھانسیوں پر لٹک گئے یا جلا وطن ہو گئے۔ پھر اس غریب شہر کو بدنام کرنا اور اس کو قدیمی ناموری اور شہرت کی نظر سے دیکھنا بے عقلی نہیں تو کیا ہے؟

غالب نے یہ تحریر ایسے درد سے لکھی ہے کہ دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ غم کا نقشہ مجسم ہو کر آنکھوں کے راستہ دل میں گھسا چلا آتا ہے۔

حسن نظامی

ہندوستان غدر کے بعد:

ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدورِ زندگی نہیں۔

اب دہلی میں ساہوکاروں کے سوا کوئی امیر نہیں ہے :

مسلمان امیروں میں تین آدمی نواب حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں، سو ان کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں ہے۔ معہذا یہاں کی اقامت میں

تذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں۔ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔

نوٹ : غدر کے بعد غالب نے دہلی کے مسلمان امرا کی تباہی کو جو جگہ جگہ نقشہ دکھایا ہے وہ آج تک اصلی خدوخال میں موجود ہے کہ خاندانی مسلمان امیر ایک نہیں۔ ساہوکار امیر ہزار ہیں۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ تجارت کا تمول نظر آتا ہے۔ حکومت کی موروثی امیری خواب وخیال ہوگئی۔

***

غالب اکیڈمی کی نئی مطبوعات

1- میرزا غالب کا روزنامچہ از شمس العلما خواجہ حسن نظامیؒ، قیمت -/50 روپے

2- غالب کی فارسی تخلیقات: تعارف وتنقید از ڈاکٹر تنویر احمد علوی، قیمت -/250 روپے

غالب اکیڈمی کی ہندی مطبوعات

1- دیوانِ غالب (مع فٹ نوٹ)، قیمت -/75 روپے

2- میرزا غالب کا روزنامچہ از شمس العلما خواجہ حسن نظامیؒ، قیمت -/50 روپے
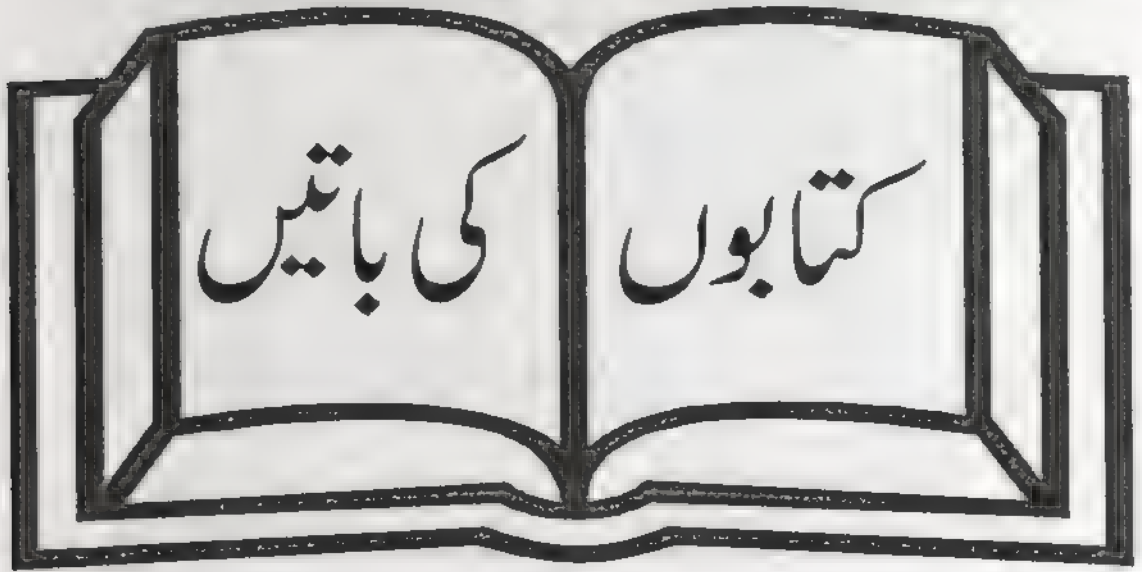
(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری)

نام کتاب	:	غالب اور غالب
مصنف	:	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
ناشر	:	موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی
قیمت	:	175/-
اشاعت	:	2006

اس کتاب میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے 9 مضامین ہیں۔ جو مختلف اوقات میں سیمیناروں میں پڑھنے یا رسائل میں چھپنے کے لئے تحریر کئے گئے ہیں۔ مضامین کے عنوانات ہیں: مکاتیب غالب میں سماجی اور تہذیبی پس منظر، غالب اور نشاۃ الثانیہ، گنجینہ معنی کا طلسم کلام غالب، دیوان غالب کا پہلا شعر، حالی اور تفہیم غالب، حالی غالب کے محقق کی حیثیت سے، طبا طبائی کی شرح دیوان غالب، غالب کے دو

ناقدین، یگانہ چنگیزی غالب کے ناقد کی حیثیت سے۔ چند مضامین کلام غالب سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں اور کچھ غالب تنقید سے۔ مصنف نے اپنے پیش لفظ میں یہ اعتراف کیا ہے کہ "غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ غالب پر لکھنے والوں کو عموماً ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کوئی نئی بات لکھ رہے ہیں نیا نکتہ پیش کر رہے ہیں۔ میں بھی ایسا کوئی دعویٰ پیش نہیں کرتا۔" غالب پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن غالب پر لکھے گئے مواد پر ابھی بہت گنجائش ہے۔ مصنف کے بعض مضامین اسی نوعیت کے ہیں۔ حالی، عبدالرحمٰن بجنوری، نظم طباطبائی، سید عبداللطیف، یگانہ چنگیزی نے غالب پر جو لکھا ہے۔ ان سب کا مزید جائزہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے اس طرف بھی توجہ دی ہے۔ ان کی کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

●●●

نام کتاب	:	"تنہا نہیں ہوں میں"
شاعر	:	اعجاز انصاری
قیمت	:	150/-
اشاعت	:	2007

"تنہا نہیں ہوں میں" گو کہ اعجاز انصاری کا پہلا شعری مجموعہ ہے مگر سرمایۂ کل نہیں ہے۔ یہ ان کی شاعری کا انتخاب ہے۔ اعجاز انصاری کا مشقِ شعر و سخن ایک عرصے سے جاری و ساری ہے۔ مشاعروں میں کلام سناتے ہیں اور داد حاصل کرتے ہیں۔ ان کے پڑھنے کا انداز منفرد ہے۔ وہ جب پڑھتے ہیں تو بڑے اعتماد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ان کا

کلام مختلف رسائل وجرائد میں شائع بھی ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پر قیصر الجعفری، پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی، احمد کمال پروازی، ساحل سحری، راشد حامدی کے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔

مجموعے کا آغاز حمد ونعت سے کیا گیا۔ پچاس سے زائد غزلیں اور کچھ نظمیں اور قطعات بھی شامل ہیں۔ اس سے لگتا ہے کہ شاعر نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اعجاز انصاری درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ مشاعروں کا اہتمام اور نظامت بحسن و خوبی کرتے ہیں۔ وہ ایک حساس انسان ہیں سماج پر گہری نظر ہے۔ پیڑ پودوں کے کٹنے سے موسم اور فضا میں تبدیلی ہو رہی ہے اس کا شدید احساس اعجاز انصاری کو ہے اور اس موضوع پر "پیڑ پودوں کو کاٹنے والو" کے عنوان سے ان کی نظم مشہور ہے۔ اس میں پیڑ کٹنے کے نقصانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں شاعر نے مشورہ دیا ہے کہ انسان کی بھلائی اور بقا کے لیے پیڑ پودوں کا قتل ختم ہو۔ انسان کو غربت کے درختوں کو کاٹنا چاہیے۔
ان کی ایک نظم جشن جمہور ہے جس میں پانچ بند ہیں اور ٹیپ کا مصرعہ ہے:

جشن جمہور منائیں تو منائیں کیسے

اس نظم میں ہندوستانی سماج آزاد ہوتے ہوئے بھی ظلم، زیادتی، نفرت، فساد، قتل جیسے مسائل سے جکڑا ہوا ہے اور ایسے میں جمہوریت کا جشن کیسے منایا جائے شاعر کا یہ سوال اس کے سیاسی، سماجی شعور کی بیداری کا غماز ہے۔ اس مجموعے کی دوسری نظمیں حوصلہ، جشن آزادی، ایک ہو جاؤ وطن کی سالمیت کے لیے۔ جشن بہاراں اور احساس روائتی موضوعات پر نظمیں ہونے کے باوجود ان میں انفرادیت اور مختلف زاویہ نظر ہے۔

مجموعے کا بیشتر حصہ غزلوں کے لیے مختص ہے۔ غزلیں چھوٹی بحر میں بھی ہیں اور بڑی بحر میں بھی ہیں۔ لیکن ان کی غزلوں کی خاص خوبی ان کے زبان کی تازگی ہے۔ غزل کے پیرائے میں نئے ڈھنگ سے بات کہنا اعجاز سے کم نہیں ہے۔

شاعر نے اپنی غزلوں میں ایسا ہی کمال دکھایا ہے کہ غزل کی مخصوص لفظیات کو استعمال کر کے اس میں زبان کی تازگی بخشی ہے ایک غزل کی ردیف ہے ٹوٹ رہا ہے۔ ستم، بھرم، غم، قلم، صنم، جیسے قافیے استعمال ہوئے ہیں۔ قافیے کے الفاظ خالص غزل کے الفاظ ہیں لیکن شعر میں ان کا استعمال محاوروں کے طور پر ہوا ہے۔

محسوس یہ ہوتا ہے پہاڑوں میں دبا ہوں
جب سے مرے دل پر ترا غم ٹوٹ رہا ہے

بے وجہ یہ پھانسی کی سزا دی گئی کس کو
کس نام پہ منصف کا قلم ٹوٹ رہا ہے

ان دو اشعار میں پہاڑوں میں دبا ہوں، دل پر غم ٹوٹنا، قلم ٹوٹنا جیسے محاورے استعمال ہوئے ہیں۔ آج کل محاوروں کا استعمال ہماری زبان سے کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اشعار میں ان کا استعمال وہی کر سکتا ہے جسے زبان پر قدرت حاصل ہو۔ اعجاز انصاری کا کلام نہ صرف یہ کہ مشاعروں میں سننے والا ہے بلکہ وہ قابل مطالعہ بھی ہے۔

●●●

نام کتاب　:　سوغات

مصنفہ　:　ذکیہ ظفر

ناشر　:　موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی

قیمت　:　-/100 روپے

اشاعت اول　:　2007

سوغات ذکیہ ظفر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''نیا رخ'' 1997 میں شائع ہوا تھا۔ ذکیہ ظفر کے افسانے مختصر ہوتے ہیں۔ زبان سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ 120 صفحے کی کتاب میں 18 افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ ان سب افسانوں میں کوئی نہ کوئی سماجی مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ مسئلہ دراصل مصنفہ کا بھی ہوسکتا ہے لیکن انھیں ذاتی مسئلے کو اس ڈھنگ سے پیش کرنے کا سلیقہ ہے کہ وہ مسائل سماجی مسائل بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل ایک افسانہ 'تعبیر' ہے جس میں ایک خواب دکھایا گیا ہے کہ ایک بھیانک شکل کا آدمی دکھائی دیتا ہے اور پھر دوسرے دن موت کی خبر آتی ہے۔ خواب میں آنے والا بھیانک شکل کا انسان ملک الموت ہے۔ اس طرح کے واقعات ایسے تمام لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں جو ضرورتاً ایک شہر سے دوسرے شہر میں آباد ہوتے ہیں جو اپنے عزیز اور قرابت دار کے بیمار ہونے کی اطلاع پانے کے باوجود آخری دیدار بمشکل کر پاتے ہیں۔

ذکیہ ظفر کی والدہ ایک اچھی مصنفہ تھیں۔ وہ تعلیم نسواں کی بڑی حامی تھیں۔ وہ ایک اچھی مقرر بھی تھیں اور انھوں نے بیشتر مضامین لکھے تھے لیکن کہیں شائع نہیں ہوئے۔ اس پس منظر میں سوغات کے یہ جملے ملاحظہ فرمائیں :

''اس کے چہرے پر مرتے وقت ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ چہرے کا نور، وہ آزاد ہونے پر فتح کا احساس نہیں تھا بلکہ اس مسکراہٹ کا راز آج مجھ پر عیاں ہوا ہے۔ اس کی اپنی بیٹی کو۔ وہ اپنے پیچھے اپنی بیٹی کی شکل میں ایک ایسی تحریر چھوڑ گئی تھی جس نے اس کی زندگی کی ساری ناکامیوں کو اپنی زندگی کی تحریک بنایا تھا۔''

افسانہ نگار نے بیش تر افسانوں میں یہی طرز اپنایا ہے جس سے سارے افسانوں میں تصنع یا بناوٹی پن کہیں بھی نظر نہیں آتا اور ایسی کہانیاں ہی بیان کی گئی ہیں جو انسانی زندگی میں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک طرح سے ذکیہ ظفر کی تمام کہانیاں وارداتی ہیں۔ اس لیے وہ ایک تاثر چھوڑتی ہیں۔ غرض یہ کہ سوغات کے سب افسانے قابل مطالعہ ہیں۔

●●●

نام کتاب	:	شان اودھ: بیگم حضرت محل
مصنف	:	وسیم احمد سعید
ناشر	:	وسیم احمد سعید، 205 سی، بابر روڈ، نئی دہلی۔
قیمت	:	250/- روپے
اشاعت اول	:	2006

1857 میں جنگ آزادی کا آغاز اگرچہ میرٹھ میں فوجی بغاوت سے ہوا اور اصل جنگ دہلی میں لڑی گئی۔ بہادر شاہ ظفر کی رہنمائی میں تمام دیسی راجاؤں اور نوابوں نے اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ ایک سال پہلے اپنی حکومت

انگریزوں کے حوالے کر کے کلکتہ منتقل ہو گئے۔ ان کے ساتھ بعض بیگمات بھی گئیں لیکن بیگم حضرت محل واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ نہیں گئیں۔ وہ لکھنو میں رہ کر انگریزوں کے خلاف جنگ کرنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ 1857 میں ہی دہلی کی طرح لکھنو میں بھی جنگ ہوئی۔ برجیس قدر جو بیگم حضرت محل کے صاحبزادے تھے، کو لکھنو کا نواب بنایا گیا۔ کئی مہینوں تک برجیس قدر کی حکومت لکھنو میں قائم رہی لیکن انگریزوں کی فوج منظم اور متحد تھی۔ جدید سازوسامان سے لیس تھی۔ ان کو دوبارہ فتح مل گئی۔ بیگم حضرت محل کے سامنے انگریزوں نے کئی تجاویز پیش کیں لیکن بیگم حضرت محل نے انگریزوں پر یقین نہیں کیا۔ جنگ لڑتے لڑتے نیپال چلی گئیں۔ وہیں ان کی آخری آرام گاہ ہے۔ اردو میں مجاہدین آزادی اور 1857 پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن بیگم حضرت محل پر اب تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ وسیم احمد سعید صاحب نے بیگم حضرت محل پر ایک جامع اور بھرپور کتاب مرتب کی ہے۔ وسیم احمد سعید صاحب کو تاریخ سے گہری دلچسپی ہے۔ اس موضوع پر ان کی انگریزی کتاب میجر ایوینٹس آف میڈیول انڈیا اور اردو کتاب بلادِ ہند کی داستان تاریخ کے دریچوں سے مشہور و مقبول ہو چکی ہیں۔

اس کتاب میں 18 عنوانات کے تحت تفاصیل درج کی گئی ہیں۔ نوابین اودھ کے تحت اودھ کے نوابین کی مختصر مگر جامع تاریخ پیش کی گئی ہے۔ واجد علی شاہ 'الوداع اے لکھنو' عنوان کے تحت بادشاہ واجد علی شاہ کا لکھنو چھوڑ کر سفر کلکتہ کا حال درج ہے۔ 'بیگم حضرت محل ۔ ایک تعارف' عنوان کے تحت بیگم حضرت محل پر دستیاب حقائق کی روشنی میں بیگم حضرت محل کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بیگم حضرت محل کی ابتدائی زندگی اور ان کے قیام نیپال کے دور کی زندگی کی بعض کڑیاں ابھی بھی مخفی ہیں۔ اسی طرح بیگم حضرت محل پر اب

تک شائع ہونے والے مضامین اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔اس کے ساتھ ہی شعرا نے بیگم حضرت محل پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ کتاب میں بیگم حضرت محل کے بارے میں اہم شخصیات کی آرا بھی درج کی گئی ہیں۔ برجیس قدر کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اور کسی حد تک قیام نیپال کے دوران برجیس قدر کے حالات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ جنگ آزادی کی اس عظیم مجاہدہ کی کوئی یادگار ہندوستان میں نہیں ہے۔ لکھنو میں صرف بیگم حضرت محل پارک ہی ان کی یاد دلاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں بیگم حضرت محل سے متعلق بہت سی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب تاریخی اہمیت کی حامل ہوتے ہوئے بھی اس کی اپنی ادبی حیثیت ہے کیونکہ اس کتاب میں بیگم حضرت محل، واجد علی شاہ اور برجیس قدر کے اشعار جا بجا پیش کیے گئے ہیں اور بیگم حضرت محل پر لکھی گئی نظموں کے لیے کتاب میں ایک مستقل باب ہے۔ اس لیے یہ کتاب تاریخ اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت دلچسپ ہے۔

●●●

ادبی سرگرمیاں

غالب اکیڈمی علمی، ادبی و ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں علمی ،ادبی و ثقافتی پروگرام منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ پروگرام نہ صرف غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقد کیے جاتے ہیں بلکہ دہلی کی مختلف انجمنیں بھی یہاں پروگرام کرتی ہیں۔ غالب اکیڈمی ہر مہینے ایک ادبی نشست کا اہتمام کرتی ہے۔غالب اکیڈمی ہر سال مرزا غالب کے یوم ولادت کے موقع پر 27/دسمبر کو غالب کے یوم وفات اور اکیڈمی کے یوم تاسیس کی مناسبت سے فروری میں پروگرام کا انعقاد کرتی ہے۔ان پروگراموں کی مختصر رپورٹ پیش خدمت ہے:

(1) یوم ولادت مرزا غالب:

27/دسمبر 2006 کو غالب کے 109 ویں یوم ولادت کی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر ہریش ترویدی نے ''غالب اردو میں غالب ہندی میں'' کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیا۔تقریب کی صدارت لندن کے مہمان اسکالر ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے کی۔ مدھومیتا بوس نے غالب کی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کیں۔ پروفیسر ترویدی نے

اپنے خطبے میں کہا کہ غالب اردو کے تو ہیں ہی اردو کی پہچان انھیں سے بنتی ہے لیکن غالب صرف اردو اور فارسی کے ہی نہیں ان کی شہرت دنیا کی تمام زبانوں میں پھیل چکی ہے۔ انھیں اور زبانوں میں ترجمہ کے ذریعے پڑھا جاتا ہے لیکن دنیا میں ایک زبان ایسی بھی ہے جس میں غالب اصل اردو میں ہی پڑھے جاتے ہیں، وہ ہے ہندی۔ ہندی میں غالب کا کلام وہی ہے جو اردو میں ہوتا ہے صرف رسم الخط بدل جاتا ہے رسم الخط کے بدلنے سے بات ختم نہیں ہو جاتی ہندی میں غالب کو پڑھ تو لیتے ہیں لیکن سمجھنا مشکل ہے۔ اس موقع پر پروفیسر نقی حسین جعفری نے تعارفی تقریر کی اور اکیڈمی کے صدر جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے خیر مقدمی تقریر کی۔ مدو میتا بوس نے غالب کی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کیں۔

(2) یوم وفات مرزا غالب اور یوم تاسیس غالب اکیڈمی:

مرزا غالب کا یوم وفات 15/فروری ہے 1869 ہے 22/فروری 1969 کو غالب اکیڈمی کا افتتاح ہوا تھا اس موقع پر ہر سال اکیڈمی پروگرام کا انعقاد کرتی ہے۔ اس سال سہ روزہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔

22/فروری 2007 کو غالب اکیڈمی میں طرحی مشاعرہ کا انعقاد:

مرزا غالب کے 138ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 38ویں یوم تاسیس کے موقع پر 22/فروری 2007 کو ایک طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے کیا۔ نظامت کے فرائض شکیل حسن شمسی نے ادا کئے اور صدارت جناب رفعت سروش نے کی۔ دہلی کے مشہور و معروف شعرا نے غالب کے مصرعے "دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا"، "نالہ پابند نے نہیں ہے" کی طرح میں اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

اس مشاعرے میں جناب مخمور سعیدی، نرمل سنگھ نرمل، سلیم صدیقی، گلزار دہلوی، رفعت سروش، وقار مانوی، متین امروہوی، ابرار کرت پوری، نور جہاں ثروت، تابش مہدی، احمد محفوظ، احمد علی برقی، ظفر مرادآبادی، شکیل حسن شمسی، شہپر رسول، اسد رضا، نصرت گوالیاری، ایم قمرالدین، فرحت احساس، شعیب مرزا، اسرار جامعی، اقبال فردوسی اور سکندر عاقل نے اپنی مطروحہ غزلیں پیش کیں۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں دہلی کے ادیب شاعر اور دانشور موجود تھے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

وہ حرم ہو دیر ہو یا میکدہ
ہے میاں گلزار پر ہر در کھلا
(گلزار دہلوی)

دل کی باتوں میں نہ آ جانا سروش
دشمن جاں ہے یہ غارت گر کھلا
(رفعت سروش)

اس کی اک چپ جانے کیا کیا کہہ گئی
یہ لفافہ بند ہونے پر کھلا
(وقار مانوی)

روز محشر کا تصور کیا کریں
ہر طرف برپا ہے اک محشر کھلا
(احمد علی برقی)

بے گھڑی کا درد جب ہم پر کھلا
چھوڑآئے ہیں ہم اپنا گھر کھلا
(نورجہاں ثروت)

موت کی آغوش میں سو جائیں گے
زندگی کا چھوڑ کر بستر کھلا
(متین امروہوی)

کیوں ہنگامہ ہے میکدے میں
اب تو وہ تنگ مے نہیں ہے
(ابرارکرت پوری)

اہل فن اس کو ہی کہہ اٹھے ظفر
جس غزل کے حسن کا جوہر کھلا
(ظفرمرادآبادی)

آہنگ سکوت دم بدم سن
یہ ساز نفس ہے نے نہیں ہے
(احمد محفوظ)

غالب اکیڈمی میں محفل کلام غالب 23رفروری 2007 کو:

23فروری 2007 کوشام ساڑھے چھ بجے محفل کلام غالب کا انعقاد کیا گیا جس میں استاداقبال احمد خان، سویتا آہوجا، وکرم جیت سکند، ڈاکٹر انیس احمد خان اوراکمل

ہلال خان نے موسیقی کے ساتھ کلام غالب پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس پروگرام کو بے حد پسند کیا گیا۔

24 رفروری 2007 کو غالب اکیڈمی میں "غالب اور عہد حاضر" پر سیمینار کا انعقاد:

غالب اور عہد حاضر کے موضوع پر غالب اکیڈمی میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح جناب جوگندر پال صاحب نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ غالب کے یہاں انسان مسلمان کے طور پر آتا ہے۔ غالب کی شرحیں ایسی لکھی گئی ہیں جیسے ان کے یہاں جامد مفاہیم ہیں۔ غالب نے بہت اہم کام کیا کہ اس نے ادب لکھا ہے زبان نہیں۔ غالب ہمہ وقت جدید تھا غالب کے یہاں اس چیز کی بڑی اہمیت تھی کہ جس طرح ہم نے زندگی کی ہے، اس کی ویسی ہی عکاسی کی ہے۔ غالب نے جنون کے ساتھ عقل کو پہلی بار شامل کیا ہے۔ انسان دوستی بھی غالب کے یہاں اہم ہے۔ غالب کی ساری باتیں نئی زندگی سے جڑی ہوئی ہیں۔

جناب خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے خیر مقدمی تقریر کی اور متین امروہوی نے منظوم خیراج عقیدت پیش کیا۔ سیمینار کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر مولا بخش نے غالب اور اردوئیت کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب اردو شاعری کی معراج کا نام ہے۔ یہ آواز صدائے بازگشت کی طرح اردو تنقید کی وادیوں میں گونجتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ارجمند آرا نے بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کا نقیب غالب کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ غالب اپنی موجودگی کا احساس ہمیں روزمرہ کی زندگی میں کراتا ہے۔ چاہے بدلتی ہوئی اخلاقی قدریں ہوں، تغیر پذیر سماج ہو، سیاسی بساط ہو، تحیر آمیز ایجادات ہوں یا پھر مکمل تصور زندگی۔ پروفیسر نقی حسین جعفری نے مثنوی ابر گہر

بار میں 'خرد' کے شعری پیکر اور جدید ذہن کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب کے بعض فارسی اشعار میں مسلک اور نظریات کے تئیں شدت پسندی کے ختم ہونے کی بشارت ملتی ہے۔ان کی یہ پیش گوئی عہد حاضر کی حیثیت سے قریب ہے۔آرنلڈ نے بھی اس زمانے میں کہا تھا کہ مستقبل کا مذہب اس کی غیر شعوری شاعری (Unconscious poetry) میں مضمر ہے۔پروفیسر عتیق اللہ، سرور الہدیٰ نے بھی اس اجلاس میں مقالے پڑھے، اجلاس کی صدارت پروفیسر شاہد حسین کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں پڑھے گئے مقالوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔نظامت کے فرائض ڈاکٹر عائشہ سلطانہ نے ادا کیے۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس میں پانچ مقالے پڑھے گئے۔ڈاکٹر شکیل اختر نے غالب اور آل انڈیا ریڈیو کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔انھوں نے کہا کہ غالب کو عوام سے روشناس کرانے میں ریڈیو نے اہم رول ادا کیا ہے۔آل انڈیا ریڈیو کی مدت 80 سال سے زائد ہو چکی ہے۔پروفیسر شمیم حنفی نے غالب اور ہمارا عہد کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ غالب کی شخصیت اور شعور میں ہمیں ان کے بعد آنے والی وجودی فکروں کا اندوہ اور جلال ایک نقطے پر مرکوز نظر آتے ہیں نشاۃ ثانیہ سے پہلے کی قدروں، ماقبل نوآبادیاتی افکار کا ایک سلسلہ غالب ہی کے وساطت سے ہمیں اپنے عہد کی دنیا تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر خالد جاوید نے ہمارے عہد میں شاعری کی آہٹیں کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب کی پوری شاعری ان کی وجودیت میں پنہا ہے۔ڈاکٹر احمد محفوظ نے مشکل پسند غالب عہد حاضر کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے غالب اور عصر حاضر کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔انھوں نے کہا کہ غالبیات کے سرمائے کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ عصر حاضر میں غالب کے متعدد اشعار بار بار مختلف

صورتوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ جلسے کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق اور پروفیسر ابن کنول نے کی اور نظامت کے فرائض ممتاز عالم نے ادا کیے۔

(3) غالب پر تحریری مقابلہ:

16 / مارچ کو بی اے اور ایم اے کے طلبا کا غالب اور 1857 کے عنوان سے تحریری وتقریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔ بی اے کے 16 اور ایم اے کے گیارہ طلبا نے حصہ لیا۔ اول، دوم اور سوم آنے والے طلبا کو ایک ہزار روپے، 750 روپے اور پانچ سو روپے ادا کیے گئے۔ نگراں کے طور پر ڈاکٹر شاہنہ تبسم، جناب نسیم عباسی اور جناب متین امروہوی نے شرکت کی۔ شرکت کرنے والوں کو جہان غالب 2 کی کاپیاں دی گئیں۔

(4) ماہانہ ادبی نشست:

غالب اکیڈمی ہر مہینے کے دوسرے سنیچر کو ایک ادبی نشست کا اہتمام کرتی ہے۔ جس میں ادیب شاعر شرکت کرتے ہیں اور اپنی نثری اور منظوم تخلیقات پیش کرتے ہیں۔

***